یکم جولائی ۲۰۲۰ء | بسم اللہ الرحمن الرحیم | جلد نمبر: ۱۳ ۔ شمارہ نمبر: ۱۳

پندرہ روزہ
معارف فیچر کراچی
MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، سید سمیع اللہ حسینی، نوید نون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، محمد عمید فاروقی

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰
فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱_۳۶۳۴۹۸۴۰ (۲۱_۹۲)
برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi. REG No. SC-1303

۱ ۔ معارف فیچر ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلا تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون، نقطۂ نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳ ۔ معارف فیچر کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

٤ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید، لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵ ۔ معارف فیچر کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

چین کی مستقبل بینی۔۔۔

امریکا اور چین کے درمیان فائیو جی ٹیکنالوجی اور دنیا کے وائرلیس انفرا اسٹرکچر پر کنٹرول کی لڑائی جاری ہے۔ تاہم دنیا کی معیشت اور تحفظ سے متعلق ایک اہم معاملے پر بہت کم توجہ دی جا رہی ہے۔ یہ معاملہ ڈیجیٹل معیشت کے لیے ضروری معدنیات پر چین کے کنٹرول کا ہے۔

کوئی بھی نیا فون، ٹیبلیٹ، گاڑی یا سیٹلائیٹ کچھ مخصوص معدنیات کے بغیر نہیں بن سکتے۔ یہ معدنیات دنیا کے کچھ ہی ممالک میں پائے جاتے ہیں اور ان کے گنے چنے متبادل ہی دستیاب ہیں۔ چینی کمپنیوں نے غیر شفاف اور اکثر سیاسی طور پر غیر مستحکم ممالک کی منڈیوں میں ان معدنیات اور دھاتوں کی فراہمی پر کنٹرول حاصل کر لیا ہے۔ اس کام کے لیے انھوں نے بڑے پیمانے پر کی گئی چینی سرمایہ کاری کا بھی استعمال کیا ہے۔ ان کمپنیوں کی رپورٹوں کے گہرائی سے مطالعے اور دیگر ذرائع سے تحقیق کے بعد FP Analytics نے معدنیات کی عالمی مارکیٹ پر اس غیر معمولی قبضے کے حوالے سے پہلی جامع رپورٹ تیار کی ہے۔ حقائق پر مبنی اس رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ چین کس تیزی اور موثر طریقے سے اپنے قومی عزائم کو پورا کر رہا ہے اور اس کے باقی دنیا پر کس قسم کے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

چین نے اپنے تیرہویں پانچ سالہ منصوبے (۲۰۱۶ء_) کو Nonferrous دھاتوں کی صنعت کے حوالے سے فیصلہ کن جنگ کا دور کہا ہے۔ اس منصوبے کا ایک اہم حصہ 'Made in China 2025' پروگرام بھی ہے۔ اس کا مقصد قومی دفاع، سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبے میں صنعت کاری کو بڑھانا ہے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے اکتوبر ۲۰۱۶ء میں چین کی وزارت صنعت نے چین کو دھاتوں کی صنعت میں عالمی طاقت بنانے کے لیے لائحہ عمل کا اعلان کیا۔ اس کام کے لیے چین معدنیات سے زرخیز خطوں میں سرکاری اور نجی کمپنیوں کو بھیج رہا ہے تاکہ ان ممالک کے معدنی وسائل پر گرفت مضبوط کی جا سکے۔ ان معدنی وسائل میں وہ معدنیات بھی شامل ہیں جن میں چین پہلے ہی ایک مستحکم پوزیشن رکھتا ہے۔

چین نے اس کام کے لیے نہایت مناسب وقت کا انتخاب کیا۔ ۲۰۱۱ء سے ۲۰۱۵ء کے دوران دھاتی اشیا کی قیمتوں میں آنے والی کمی سے کان کنی کی بہت سی کمپنیاں سرمائے کے متعلق پریشان تھیں۔ یہاں تک کہ Angola American جیسی بڑی کمپنی کو بھی افرادی قوت اور اثاثوں میں کمی کرنا پڑی۔ چینی کمپنیوں نے کانوں کی براہ راست خریداری، دیگر کمپنیوں میں حصص کے حصول، کانوں کی موجودہ اور مستقبل کی پیداوار کو خریدنے کے معاہدوں اور نئے پروجیکٹ میں سرمایہ کاری کی شکل میں کان کنی کی کمپنیوں کو ان کی ضرورت کا سرمایہ مہیا کیا اور خود معدنیات کی عالمی پیداوار پر کنٹرول حاصل کر لیا۔

اگرچہ چین میں کافی معدنیات پائی جاتی ہیں، تاہم چین کو کوبالٹ، پلاٹینیم گروپ کی دھاتوں اور تھیئم جیسی معدنیات کے فقدان کا سامنا ہے۔ یہ ٹیکنالوجی کے حوالے سے چین کے عزائم کے لیے اہم ہیں۔ چین نے ان معدنیات پر کنٹرول کے لیے دو طرح کی حکمت عملیاں اختیار کی ہیں۔ ایک حکمت عملی یہ ہے کہ حکومتی ملکیت والی کمپنیوں یعنی State Owned Enterprises (SEOs) کو متحرک کیا جائے، جو حکومتی امداد اور سرمایہ کاری کا استعمال کرتے ہوئے خود کو دیگر ممالک میں مضبوط کریں اور حکومتی افراد کے ساتھ مراسم پیدا کریں۔ دوسری حکمت عملی ان ہی مقاصد کے حصول کے لیے نجی کمپنیوں کے استعمال کی ہے۔

اپنی اس حکمت عملی کی وجہ سے چین معدنیات کے اس کھیل میں دنیا سے دس سال آگے ہے۔ رواں سال جون میں کانگو میں ہونے والی ایک کانفرنس میں ۵۳ چینی کمپنیوں نے Union of Mining Companies کے قیام کا اعلان کیا۔ یہ دراصل چینی صنعت کاروں اور کانگو کی حکومت کے درمیان اس گہرے اور دیرپا تعلق کا اعلان تھا، جو گزشتہ سالوں میں قائم ہوا۔

چین اس وقت کانگو سے نکلنے والے کوبالٹ کے نصف حصے پر اپنا کنٹرول رکھے ہوئے ہے۔ صدارتی انتخابات سے چھ مہینے قبل ہونے والی اس کانفرنس نے صدارتی امیدواروں کو واضح پیغام دیا کہ کوبالٹ کی صنعت پر چین کس قدر کنٹرول رکھتا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ کانگو کی ۸۰ فیصد معیشت کا انحصار کوبالٹ پر ہے۔

اندرونی صفحات پر:۔

- پاکستانی میڈیا میں چینی پالیسی کے اثرات
- چین سے ڈرنے کی ضرورت نہیں!
- چین کی عسکری سرگرمیاں: امریکا کے لیے پیغام
- کھلا تنازع، خاموش معاہدہ یا پھر شراکت داری؟
- 'نیتن یاہو اور 'گریٹر اسرائیل' کا خواب
- بھارت کا دیوقامت دفاعی بجٹ
- ترکی کا مثالی کتاب کلچر
- مابعد حقیقت، جعلی خبریں اور میڈیا

دنیا میں کوبالٹ کی کل پیداوار اور معلوم ذخائر کا دو تہائی حصہ کانگو میں ہے، جس وجہ سے یہ بیٹری کی صنعت سے منسلک سرمایہ کاروں کے لیے ایک اہم ملک ہے۔ اسی وجہ سے چین نے گزشتہ ایک دہائی میں سیاسی تعلقات کے فروغ اور پیداواری انفرااسٹرکچر میں سرمایہ کاری کے ذریعے یہاں اپنی پوزیشن مضبوط کی ہوئی ہے۔ ۲۰۰۷ء میں چین کے Export-Import Bank نے انفرااسٹرکچر کی مد میں ۹ ارب ڈالر (جو بعد میں ۳ ارب ڈالر کر دیے گئے) اور تانبے اور کوبالٹ کی کان کنی کے لیے ۳ ارب ڈالر فراہم کیے۔ یہ پراجیکٹ **Sinohydro** اور China Railway Group کے تحت چلائے جا رہے ہیں۔ ان کمپنیوں کے پاس تانبے اور کوبالٹ کی کان Sicomine کے ۸۶ فیصد حصص ہیں۔ یہ کان افریقا کی سب سے بڑی کانوں میں سے ایک کان ہے۔ چین نے کانگو کی سرکاری کمپنی Gécamines کی بحالی، صنعتی شعبے کے استحکام اور ملازمت کے مواقع پیدا کرنے کے وعدے سے کانگو کا خود پر انحصار بڑھا لیا ہے۔

کانگو کی قرضوں میں ڈوبی ہوئی کمپنیوں کو ٹارگٹ کر کے چین کی سرکاری کمپنیوں نے کانوں میں حصص حاصل کیے اور اپنا اثر و رسوخ بڑھایا۔ ان کانوں میں Tenke Fungurume نامی کان بھی شامل ہے، جہاں اعلیٰ قسم کے تانبے اور کوبالٹ کے دنیا کے بڑے ذخائر میں سے ایک موجود ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ چین نے کانگو کی ۱۰ بڑی کانوں اور ۲ ترقیاتی منصوبوں کی ملکیت حاصل کر لی ہے۔ چین نے کانگو اور دنیا کی کوبالٹ پیدا کرنے والی سب سے بڑی کان میں بھی حصص حاصل کر لیے ہیں۔ اس کی وجہ سے کانگو میں کوبالٹ کی کل پیداوار کے ۵۲ فیصد پر چین نے اپنا اثر ورسوخ قائم کر لیا ہے۔

دنیا میں کوبالٹ کی بڑھتی ہوئی مانگ کے سبب کانگو کے سابق صدر جوزف کابیلا نے کان کنی کے قانون میں تبدیلی کی اور منافع پر ۵۰ فیصد ٹیکس عائد کر دیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے کوبالٹ پر **Royalty Tax** کو بھی تین گنا کر دیا ہے تاکہ اس سے حکومتی منافع میں اضافہ ہو۔ ہمسایہ ملک زیمبیا میں بھی اسی قسم کے ٹیکس کے بارے میں سوچا جا رہا ہے۔

سرکاری ملکیت کی کمپنیوں کو استعمال کرنے کی چین کی حکمت عملی افریقا میں خاص کامیاب رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کان کنی کی صنعت میں جاری معاشی بدحالی میں ان کمپنیوں کو لوگوں نے امید کی ایک کرن کے طور پر دیکھا۔ ان کمپنیوں نے China -Africa Development Fund کے اشتراک سے خود کو جنوبی افریقا کے Bushveld Complex تک پھیلا لیا ہے۔ اس خطے میں دنیا کا اعلیٰ ترین وینیڈیم اور پلاٹینیم پایا جاتا ہے۔ پلاٹینیم گاڑیوں کے کیٹیلیٹک کنورٹر میں استعمال ہوتا ہے، جو گاڑیوں سے نکلنے والے خطرناک دھوئیں کو صاف کرتا ہے۔ وینیڈیم ہائی ٹیک صنعتوں، دفاعی صنعت، خلابازی کی صنعت اور قابل تجدید توانائی کے شعبوں کے لیے ایک انتہائی اہم اور لازمی دھات ہے۔ اس خطے میں چین کی سرمایہ کاری اور طویل مدتی معاہدوں کی وجہ سے جنوبی افریقا کی کل برآمدات میں معدنیات کا حصہ سب سے زیادہ ہو گیا ہے اور معدنیات کی کل برآمدات کا ۵۰ فیصد حصہ چین جاتا ہے۔ اس وجہ سے جنوبی افریقا کی معاشی بحالی بھی اب براہ راست چینی سرمایہ کاری سے جڑی ہوئی ہے۔

چین جمہوری اور Market-Oriented ملکوں میں نجی ملکیت کی چینی کمپنیوں کا استعمال کر رہا ہے، جنھیں حکومتی سرمایہ مہیا کیا جاتا ہے۔ یہ کمپنیاں مقامی کمپنیوں میں حصص حاصل کرتی ہیں اور چھوٹے کاروباری لوگوں کی سرپرستی کرتی ہیں۔ نجی ملکیت کی کمپنیوں کو استعمال کرنے کی حکمت عملی آسٹریلیا، ارجنٹینا اور چلی میں واضح طور پر کامیاب ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان تین ممالک میں دنیا کا ۹۰ فیصد لیتھیم پیدا ہوتا ہے۔ اور ان ہی تین ممالک میں دنیا میں لیتھیم کے معلوم ذخائر کا تین چوتھائی حصہ بھی موجود ہے۔ صرف چھ سالوں میں چین نے لیتھیم کی مارکیٹ پر غلبہ حاصل کر لیا ہے اور اب وہ لیتھیم کے ۵۹ فیصد ذخائر پر اپنی گرفت رکھتا ہے۔

چین کے سرکاری بینکوں کے سرمائے سے چین کی دو بڑی کمپنیاں Tianqi Lithium اور Ganfeng Lithium دنیا میں لیتھیم پیدا کرنے والی تیسری بڑی کمپنیاں بن گئی ہیں۔ ان دونوں کمپنیوں نے دیگر چینی اداروں کے ساتھ مل کر اپنی سرمایہ کاری اور کام کو پھیلانے کے لیے چلی کی کمپنیوں میں حصص حاصل کیے، ارجنٹینا میں ترقیاتی منصوبوں میں سرمایہ کاری کی اور آسٹریلیا میں کانوں کی خریداری اور پروسیسنگ پلانٹ میں سرمایہ کاری کی۔

۲۰۱۸ء کے ابتدا میں Tianqi Lithium نے چلی کی ایک کمپنی SQM کے ۲۴ فیصد حصص حاصل کیے۔ یہ کمپنی دنیا میں لیتھیم پیدا کرنے والی دوسری بڑی کمپنی ہے۔ دنیا میں پائے جانے والے لیتھیم کے ذخائر کا ۵۷ فیصد حصہ چلی میں پایا جاتا ہے، ان میں سے آدھے ذخائر کا کنٹرول SQM کے پاس ہے۔ SQM کے حصص حاصل کرنے کی ڈیل معدنیات کی صنعت میں اب تک کی سب سے بڑی ڈیل ہے، جو ۴ء۱ ارب ڈالر میں انجام پائی۔

چلی کی حکومت نے ہمیشہ ملک کے لیتھیم کے ذخائر پر سخت کنٹرول رکھا ہے کیوں کہ یہ ملک کے جوہری پروگرام کے لیے اہم ہے، لیکن چینی کمپنی کو حصص کی فروخت نے اس معاملے میں شکوک پیدا کر دیے ہیں۔ اگرچہ اصل ڈیل میں Tianqi کے بورڈ کو SQM کے حساس ڈیٹا تک رسائی سے روکا گیا ہے، تاہم اب بھی یہ چینی کمپنی SQM پر خاطر خواہ اثر رسوخ رکھتی ہے۔

ارجنٹینا کے صدر نے ملک میں معدنیات کی برآمدات پر عائد ٹیکسوں میں کمی کا فیصلہ کیا ہے۔ یہاں چین معدنیات کے شعبے میں سرمایہ کاری کر رہا ہے اور بدلے میں مستقبل میں نکلنے والے لیتھیم کے حصول کے معاہدے کر رہا ہے۔ چینی کمپنیوں کے پاس ارجنٹینا میں جاری معدنی منصوبوں کے ۴۱ فیصد حصص ہیں۔ ان منصوبوں میں ارجنٹینا کے کل ذخائر کا ۷۳ فیصد شامل ہے۔ اس پالیسی کے ثمرات بھی سامنے آنا شروع ہو گئے ہیں۔ ارجنٹینا سے چین کو ہونے والی لیتھیم کی برآمدات میں ۲۰۱۵ء سے ۲۰۱۷ء کے دوران چار گنا اضافہ ہوا ہے۔ یہی پالیسی آسٹریلیا میں بھی کامیاب رہی۔ مذکورہ دونوں چینی کمپنیوں نے آسٹریلیا میں جاری لیتھیم کی کان کنی کے منصوبوں میں ۹۱ فیصد حصص اور لیتھیم کے ذخائر کے ۵۷ فیصد پر کنٹرول حاصل کیا ہوا ہے۔

عالمی منڈی کے وہ وسائل جن پر چین کی اجارہ داری ہے، اب چین ان پر بھی اپنے کنٹرول کو مزید سخت کرنے کے لیے اقدامات کر رہا ہے۔ چین ایسے قدرتی وسائل میں نہ صرف خودکفیل ہے بلکہ اس کے پاس یہ معدنیات وافر مقدار میں ہیں، جیسا کہ دنیا بھر کی وہ ۱۰ معدنیات اور دھاتیں جو مقدار میں سب سے کم ہیں اور ہائی ٹیک صنعت کے لیے کلیدی حیثیت رکھتی ہیں وہ بھی وافر مقدار میں ہیں اور یہی وہ دھاتیں ہیں جن پر چین کے کمرشل اور تزویراتی حریف انحصار کرتے ہیں۔ اپنے کنٹرول کو مزید مستحکم کرنے کے لیے چینی کمپنیاں نہ صرف ان دھاتوں کی کانوں کی خریداری کر رہی ہیں بلکہ ان کی پیداوار کی خریداری بھی بڑے پیمانے پر کر رہی ہیں، جس سے چین کو ہائی ٹیک صنعت میں سبقت حاصل ہو جائے گی بلکہ اس کی جیوپولیٹیکل طاقت میں بھی اضافہ ہو گا۔

شاید معدنی وسائل پر اپنے غلبے کو برقرار رکھنے اور نادر و اہم کیمیائی عناصر کو دریافت کرنے کی خواہش کے اعتبار سے

چین کی مثال نہایت موزوں ہے۔ ۱۷ر ایسے مشہور کیمیائی عناصر جنہیں با آسانی تجارتی بنیادوں پر دستیاب کیا جاسکتا ہے لیکن چین دانستہ ایسا نہیں کررہا۔ یہ سارے عناصر دفاعی سازو سامان، خلابازی، برقیات اور قابل تجدید توانائی کی صنعتوں کے لیے اہم ہیں۔ گزشتہ دو دہائیوں میں چین نے ان اہم کیمیائی عناصر کی کل پیداوار کا ۸۰ فیصد نکالا اور ان معدنیات کو صاف کیا ہے۔ ۲۰۱۰ء میں چین نے جاپان کو ان کیمیائی اشیا کی فراہمی میں تخفیف کردی تھی، جس کی وجہ چین کے مشرقی سمندر میں کشیدگی کی فضا کا پیدا ہونا تھا۔ اس کے اگلے ہی سال چین نے ایکسپورٹ کوٹہ نافذ کر دیا، جس سے صنعتی اداروں اور حکومتوں میں افراتفری پیدا ہوگئی۔ لیکن جاپان کے سوا دیگر ممالک نے اس بار وقتی اقدامات تو کیے لیکن مستقبل کے حوالے سے کوئی خاص منصوبہ بندی نہیں کی۔

۱۹۹۰ء میں چین نے rare earth elements کو تزویراتی وسائل قرار دے کر اس شعبے میں غیر ملکی سرمایہ کاری پر پابندی لگادی۔ ۶ سرکاری کمپنیاں اس ساری صنعت پر مکمل کنٹرول رکھتی ہیں۔ ۲۰۱۸ء میں حکومت نے اس کی پیداوار میں ۶۳ فیصد کمی کردی۔ جب کہ دوسری طرف ان معدنیات کی مانگ میں ۲۰۲۵ء تک ۱۷ فیصد اضافہ ہوگا۔ اسی طرح چین دیگر ملکی معدنیات پر بھی مکمل کنٹرول کیے ہوئے ہے۔ چینی کمپنیاں تیزی سے دیگر ممالک میں بھی ان معدنیات کی کانیں خرید رہی ہیں۔ اسی طرح روس بھی اس شعبے میں غیر ملکی سرمایہ کاری کو محدود کرتا جارہا ہے۔ اس کے برعکس امریکا کی rare earth elements کی درآمدات میں مستقل اضافہ ہورہا ہے۔ صرف ۲۰۱۸ء میں امریکا نے ۱۶۰ ملین ڈالر کی درآمدات کی ہیں۔ اگرچہ صدر ٹرمپ نے اس معاملے پر کچھ احکامات جاری کیے، لیکن اس پر مزید کام نہیں ہوسکا ہے۔ اس کے برعکس چینی کمپنیاں تیزی سے دنیا بھر کی کمپنیوں سے شراکت داریاں کررہی ہیں اور چین نے بحیثیت ریاست اس پر بھرپور توجہ دے رکھی ہے۔ جس سے چین کی جیوپولیٹیکل طاقت میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے۔

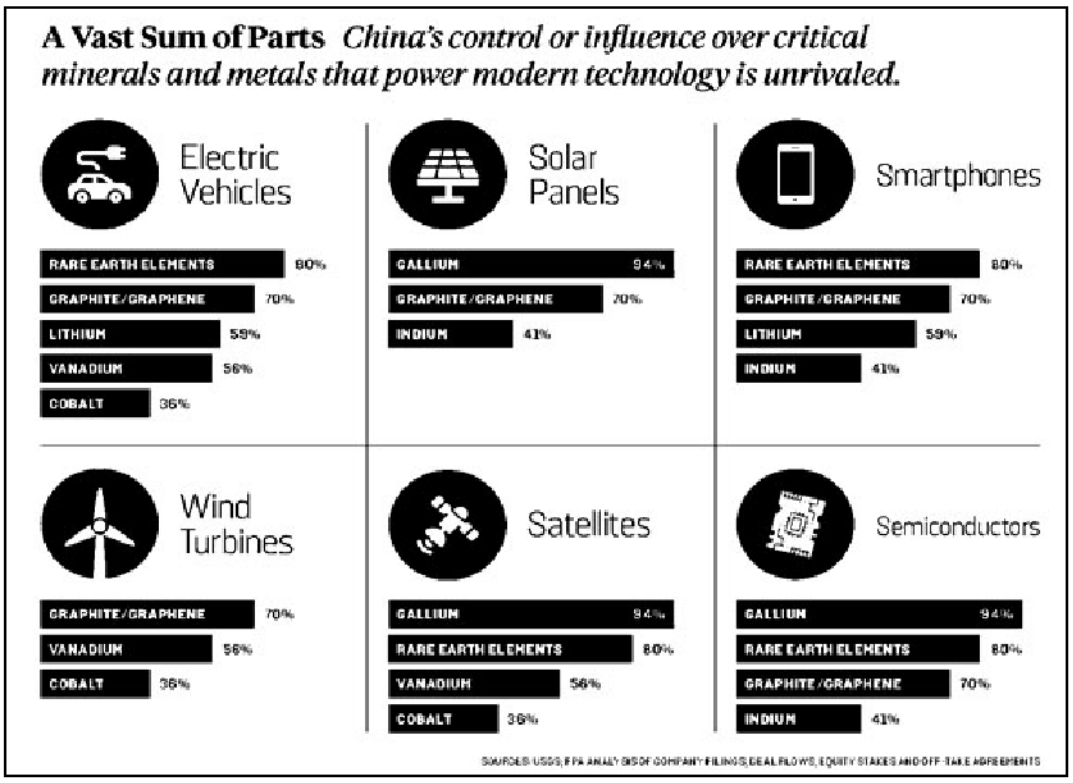

وسائل کی ان اقسام پر کنٹرول قائم کرنے سے چین کو اس بات کا اندازہ ہوجائے گا کہ آیا وہ semiconductor کی صنعت پر سبقت لے جانے سے وہ اس صنعت میں بھی مرکزی حیثیت حاصل کرلے گا۔ ہائی ٹیک انڈسٹری کے لازمی جزو کے طور پر استعمال ہونے والی معدنیات پر چین کا کنٹرول تقریباً مکمل ہوچکا ہے۔ اس انڈسٹری میں مزید ترقی کے لیے جن معدنیات کی ضرورت ہے، ان سات میں سے چھ پر چین کا ۵۷ فیصد کنٹرول ہے۔

تاہم چین کے پاس اس صنعت کی صف اول کی کمپنیوں جیسے semiconductor تیار کرنے کی صلاحیت کا اب بھی فقدان ہے۔ اور چین اب بھی تقریباً ۲۶۰ ارب ڈالر ان کی درآمدات پر خرچ کررہا ہے۔ حکومت اپنے حریفوں کو پیچھے چھوڑنے کے لیے اس شعبے پر اپنی توجہ مرکوز کیے ہوئے ہے۔ چین نے اس شعبے میں ریسرچ اینڈ ڈویلپمنٹ پر ۲۰۱۴ء سے ۲۰۱۷ء تک ۲۰ ارب ڈالر کی خطیر رقم خرچ کی ہے۔

اگر چین اس صنعت میں بھی مکمل مہارت حاصل کرلیتا ہے اور منڈیوں میں اس صنعت سے متعلق اشیا کی بھرمار کرتا ہے (جیسا کہ اس نے سولر پینل اور ونڈ ٹربائین کے معاملے میں کیا تھا) تو نہ صرف ان اشیا کی دیگر صنعتیں تباہ ہوجائیں گی بلکہ ہماری قومی سلامتی، دفاعی نظام، ہماری معیشت کا انحصار بھی چینی صنعتوں پر بڑھ جائے گا۔ جیسا کہ سرکاری حکام اب semiconductor کی فروخت پر نگرانی شروع کر چکے اور اس کی فروخت کو محدود کرتے جارہے ہیں، اسی طرح امریکی حکومت نے مختلف چینی کمپنیوں کو semiconductor کی فروخت پر عارضی پابندی لگائی ہے ان اقدامات سے چین کی مقامی صنعت کو خودمختار بنانے کا نہ صرف جذبہ بڑھے گا بلکہ وہ اس پر تیزی سے کام بھی کرے گا۔ اصل توجہ اس بات پر دینی چاہیے کہ چین ان معدنی وسائل کے خام مال پر مکمل کنٹرول حاصل نہ کرپائے اور نہ ہی computing power خودمختاری حاصل کرے۔

لیکن یہ کوئی حتمی مشاہدہ نہیں ہے۔ تاہم اس بات پر ازسرنو غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم تزویراتی صنعتوں اور طویل مدتی سرمایہ کاری کو کتنی اہمیت دیتے ہیں، اس کے علاوہ معاشی خوشحالی اور قومی سلامتی کے شعبے کو اس ڈیجیٹل دور میں کس تناظر میں دیکھتے ہیں۔ کچھ ممالک تو اس حوالے سے نہ صرف سوچ رہے ہیں بلکہ بھرپور اقدامات بھی کررہے ہیں۔ ماہ اپریل میں امریکی حکام نے lithium کی صنعت سے تعلق رکھنے والے ماہرین اور اسٹیک ہولڈرز سے ایک میٹنگ کی، جس میں انھوں نے بجلی سے چلنے والی گاڑیوں کے لیے ملکی طور مکمل سپلائی چین (Supply Chain) بنانے پر حکمت عملی تشکیل دینے کی بات کی۔۔۔ اور یہ ایک آغاز ہے۔۔

(یہ رپورٹ امریکی جریدے Foreign Policy کے تحقیقی شعبے FP Analytics نے مئی ۲۰۱۹ء میں جاری کی ہے۔)

●●●

پاکستانی میڈیا میں چینی پالیسی کے اثرات

Nowmay Opalinski

چین پاکستان کے مرکزی میڈیا میں اپنا اثر ورسوخ بڑھا رہا ہے، دونوں ممالک ٹیلی کمیونیکیشن اور میڈیا کی نگرانی کے شعبے میں دوطرفہ تعاون پر مل کر کام کر رہے ہیں، دوطرفہ تعاون کی مدد سے سوشل میڈیا یا انٹرنیٹ کے ذریعے پاکستانی حکومت پر ہونے والی تنقید کو مقامی طور پر سنسر کیا جاسکے گا، یہ صورتحال چین کے حق میں کس طرح فائدہ مند ہے اور چین کی وسیع تر میڈیا پالیسی کیسے اس صورتحال میں اپنے قدم جما سکے گی؟

چین کے طرز پر پاکستانی میڈیا پر سنسر شپ کا نفاذ

۲۰۱۲ء سے پاکستانی حکومت یہ کوشش کر رہی ہے کہ آن لائن مواد کے اشتراک (content sharing) کو کس طرح قابو میں کیا جائے، اس پر سنسر شپ نافذ کی جائے۔ پاکستان الیکٹرانک کرائم ایکٹ ۲۰۱۶ء کے ذریعے ایک ایسا قانون متعارف کرایا گیا ہے، جو دہشت گردوں کے جانب سے کیے گئے پروپیگنڈے کو سنسر کرے گا لیکن یہی قانون حزب اختلاف کی جانب سے حکومت پر کی گئی تنقید کو سنسر کرنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

پاکستان نے جنوری ۲۰۲۰ء میں شہریوں کی حفاظت کے لیے نئے اصول طے کیے گئے ہیں، اس منصوبے میں وزیر انفارمیشن وٹیکنالوجی اینڈ کمیونیکیشن کو آن لائن مواد کے اصول وقواعد طے کرنے کے لیے مقامی نمائندہ مقرر کرنا تھا، انسانی حقوق کی تنظیموں اور وفاقی یونین جرنلسٹ نے اس کی مذمت کی ہے اور اسے خلاف آئین قرار دیا ہے۔ ''رپورٹس ودآؤٹ بارڈرز'' اور قانونی ماہرین نے یہ بات واضح کی ہے کہ لفظ ''نفرت پر مبنی'' یا ''ریاست کے خلاف'' کی تعریفیں اتنی وسیع ہیں کہ اسے استعمال کرتے ہوئے کسی بھی طرح کے مواد یا تحریر کو شدت پسندانہ قرار دے کر ہٹایا جاسکتا ہے۔

درخواست کی شق نمبر ۶ سوشل میڈیا کمپنیز کو نجی ڈیٹا فراہم کرنے پر مجبور کرتی ہے، سوشل میڈیا کمپنیاں اس کے علاوہ صارف کی معلومات، ڈیٹا ٹریفک تحریری مواد کے ساتھ ساتھ دیگر معلومات بھی فراہم کرنے کی پابند ہیں۔

اس نئے ضابطے کے تحت سوشل میڈیا کمپنیاں پاکستان میں اپنے دفاتر کھولنے کی پابند ہوں گی جہاں ان پر ڈیٹا کو ڈیلیٹ کرنے کے لیے سخت دباؤ ڈالا جاسکے گا، یہ مقامی نمائندہ کی ذمہ داری ہوگی کہ آن لائن پلیٹ فارم کا تمام نجی و غیر نجی ڈیٹا یا مواد تک اس کی پہنچ ہوگی۔ یہ صورتحال بین الاقوامی کمپنیوں کے لیے پریشان کن ہے اور وہ پاکستان میں اپنے آپریشن کو جاری رکھنے یا نہ رکھنے کے فیصلے کا ازسرنو جائزہ لے رہی ہیں۔ ''ایشین انٹرنیٹ اتحاد'' نے وزیر اعظم عمران خان کے سامنے اپنے بیان میں تحفظات کا اظہار کیا ہے، تاہم یہ اقدامات چینی کمپنیوں کے لیے قابل قبول ہیں، چین کی آن لائن کمپنیاں پاکستان کو متبادل ملک کے طور پر دیکھ رہی ہیں۔

گو کہ اس طرح کا تعاون کبھی نہیں ہوا، لیکن پاکستان میں کمیونی کیشن کے شعبے میں چین کے بڑھتے اثرات بتا رہے ہیں کہ بہت جلد یہ معاملات طے پا جائیں گے، جیسے پاک چین سرحد پر نئی فائبر آپٹک کیبل بچھائی گئی ہے، جو سنکیانگ سے براستہ خنجراب راولپنڈی تک جاتی ہے۔ اس میں چین کے regulated نیٹ ورک کے ذریعے انٹرنیٹ ٹریفک کی رونگ کی جائے گی، اس سے براہ راست رابطے کے ذریعے پاکستان کو برآمد شدہ چین کے فائروال سسٹم کو سہولت ہوگی۔ چین دیگر ممالک کو سوشل میڈیا نگرانی کے آلات برآمد کرتا رہا ہے۔ یہاں پر چین کا مقصد اقوام متحدہ کے بین الاقوامی اصولوں کے تحت انٹرنیٹ کی آزادی اور اس کے تحت دوسرے قوانین کے لیے کام کرنے والے گروپ کے سامنے اپنے انٹرنیٹ کنٹرول آلات کی نمائش بھی ہے۔

چین کی میڈیا حکمت عملی کے ساتھ صف بندی

دسمبر ۲۰۱۹ء میں وزیر اعظم پاکستان کی مشیر اطلاعات فردوس عاشق اعوان نے مقامی ذرائع ابلاغ سے اپیل کی کہ وہ ''چین پاک اقتصادی راہداری'' کی کامیابی کے لیے کام کرے اور اس کے خلاف منفی پروپیگنڈے کا جواب دے، انہوں نے یہ بیان امریکا کی طرف سے نامزد کردہ جنوبی ایشیا کے اسسٹنٹ سیکریٹری ایلس ویلز کی طرف سے اقتصادی راہداری کو شدید تنقید کا نشانہ بنائے جانے کے بعد دیا تھا۔

اس وقت سے پاکستانی اور چینی ذرائع ابلاغ قریبی تعلقات اور تعاون کا اعادہ کرتے رہے ہیں، اس سلسلے میں کافی حد تک کام شروع بھی ہو چکا ہے۔ مقامی پاکستانی میڈیا اور چین کی سنہوا نیوز ایجنسی کے درمیان مفاہمتی یادداشت پر دستخط ہو چکے ہیں۔ اس معاہدے میں چینی عہدیدار اپنے پاکستانی ہم منصب کو اردو اور انگریزی میں موجود مواد (content) فراہم کرنے کے پابند ہوں گے، مواد کی فراہمی دونوں ملکوں کے میڈیا کو قابو میں رکھنے میں مددگار ثابت ہوگی، مرکزی میڈیا کے لیے اہم اصول بنانے میں آسانی رہے گی اس کے علاوہ بیلٹ اور روڈ منصوبے کے لیے ذرائع ابلاغ فعال کردار ادا کرے گا۔

اس کے ساتھ یہاں پر ایک وسیع حکمت عملی کام کر رہی ہے، چین اداروں کے ذریعے نیوز پروڈکشن کی برآمد پر کام کر رہا ہے۔ جیسے بیلٹ اینڈ روڈ نیوز نیٹ ورک کا منصوبہ، اس کے ذریعے بہت سارے منصوبے ترتیب دیے جا چکے ہیں۔ ریاستی چینلز کی مدد سے بڑی تعداد میں آن لائن مواد چھاپا جا رہا ہے، حالیہ انٹرویو میں پاکستان کے ریاستی میڈیا نے یہ رپورٹ کیا ہے کہ سی پیک کے خلاف پروپیگنڈے کا جواب دینے کے لیے پاکستان میں چین کے تعاون سے ''رسپانس انیشیٹو سسٹم'' نافذ کیا جائے گا۔ فوری طور پر پاکستان کے صحافیوں کے لیے چین میں تربیتی پروگرام منعقد کیے جائیں گے۔ چین دنیا میں ایک نئی طرز کی صحافت متعارف کرانے جا رہا ہے، اس سلسلے میں بین القوامی کانفرنسز کا انعقاد کیا جائے گا جیسے ''بیلٹ اینڈ روڈ صحافتی فورم'' یا ''پاک چین میڈیا فورم''۔

مواد (content) کو کنٹرول کرنے سے قطع نظر چین اس وقت ذرائع ابلاغ کے شعبے میں سرمایہ کاری کے ذریعے ریاستی میڈیا تیار کر رہا ہے تاکہ وہ آزاد پبلک یا پرائیویٹ میڈیا کو قابو کرنے میں زیادہ وقت ضائع کرنے سے بچ سکے۔ چین کی نظر میں آزاد میڈیا کو کنٹرول کرنے کی محنت سے زیادہ بہتر ہے کہ ریاست کا حمایتی میڈیا متعارف کروایا جائے، جو پاکستان اور چین دونوں حکومتوں کے مفادات کے لیے یکساں طور کام کرے۔

پاک چین ذرائع ابلاغ کا مستقبل

پاکستان اور چین جیسے جیسے ذرائع ابلاغ کی ترقی اور اسے تقویت دینے کے لیے کام کر رہے ہیں، ویسے ویسے چین کا ''کنٹرولڈ میڈیا ماڈل'' اسلام آباد کے لیے قابل قبول ہوتا جا رہا ہے۔ پچھلے دو سالوں میں پاکستانی میڈیا میں سی پیک پر ہونے والی تنقید کو ختم کیا جا چکا ہے۔ حالیہ دنوں میں چین کے تعاون سے جس طرح ٹیکنالوجی کی مدد سے میڈیا کی نگرانی اور میڈیا سنسر شپ پر کام کیا گیا ہے، آنے والے دنوں میں اس کا نتیجہ آزادی اظہار میں رکاوٹ یا سوشل میڈیا پر پابندی کی صورت میں نکلے گا۔

(مترجم: سمیہ اختر)

"The China factor in Pakistan's media landscape". ("eurasiareview.com". June 2,2020)

چین سے ڈرنے کی ضرورت نہیں!

Michael Schuman

چین کی بڑھتی ہوئی قوت نے امریکا اور یورپ کی نیندیں اڑا رکھی ہیں۔ عالمی امور میں چین کا اثر و رسوخ روکنے کی خاطر امریکا اور یورپ مل کر بہت کچھ کر رہے ہیں۔ عالمی سیاسی و مالیاتی نظام کی ہیئت تبدیل کرنے کی بھرپور کوشش کی جارہی ہے۔ جن خطوں کو امریکا اور یورپ نے مل کر ایک زمانے تک لُوٹا ہے اُنہیں تادیر اپنی مٹھی میں رکھنے کی تگ و دو تیز تر ہوگئی ہے۔ دونوں چاہتے ہیں کہ اُن کا راج برقرار رہے، چاہے باقی دنیا کی مٹی پلید ہوتی رہے۔ مغرب کے بیشتر سیاسی تجزیہ کار اور تجزیہ نگار دن رات یہی راگ الاپ رہے ہیں کہ سب کچھ چین کے ہاتھوں میں چلا گیا تو دنیا تلپٹ ہو جائے گی، چل نہیں پائے گی۔ کوئی اُن سے یہ پوچھے کہ سب کچھ مغربی طاقتوں کے ہاتھوں میں ہونے سے کون سی بہتری آگئی، کس خطے کا بھلا ہوگیا۔ چین کی بڑھتی ہوئی قوت سے پریشان مغربی طاقتیں اب کھیل کو بگاڑنے پر تُل گئی ہیں۔ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ عالمی سیاست و معیشت پر اگر چین متصرّف ہوگیا تو کسی کو دو وقت کی روٹی بھی نہ مل سکے گی۔

جب چین کا معاملہ زیرِ غور ہو تو معاملات وہ نہیں ہوتے جو دکھائی دے رہے ہوتے ہیں۔ اب ایسا تاثر پیدا ہو رہا ہے کہ کورونا وائرس سے نمٹنے کے معاملے میں غیر معمولی استعداد کا مظاہرہ کرکے چین نے خود کو امریکا کی جگہ سپر پاور کے درجے پر فائز کرلیا ہے۔ یہ تاثر مغرب پوری دنیا میں جڑ پکڑ رہا ہے۔ امریکا نے چند ایک معاملات میں کمزوری دکھائی ہے۔ اس کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چین نے معاملات کو اپنے حق میں کرنے کے حوالے سے تساہل کا مظاہرہ نہیں کیا۔

سوال یہ ہے کہ کیا ہم نے کسی اور چیز کی توقع رکھی تھی؟ یہ تو آپ نے بھی سنا ہی ہوگا کہ سب کچھ چینی تیار کرتے ہیں۔ امریکی تو بس اُنہیں ڈبوں میں پیک کرکے اُن کی مارکیٹنگ کرتے ہیں۔ چین طویل المیعاد کھیل کھیلتا ہے۔ ہم امریکی آئندہ انتخابات سے آگے کا نہیں سوچ سکتے۔ اور ہر تین ماہ بعد جاری کی جانے والی معاشی رپورٹس تک محدود رہتے ہیں۔ چینیوں نے کورونا وائرس کو کنٹرول کرنے کے حوالے سے غیر معمولی نوعیت کا کریک ڈاؤن کیا اور کامیابی حاصل کرلی۔ اور اب وہ صورتِ حال کے فوائد بٹور رہا ہے۔ چین نے کورونا کی وبا سے متعلق تمام ممکنہ کامیابیاں حاصل کرلی ہیں مگر امریکا اب تک رگڑا ہی کھا رہا ہے۔ ایک طرف تو یہ غم ہے کہ کورونا کی وبا کے ہاتھوں بڑے پیمانے پر ہلاکتیں واقع ہوئی ہیں اور دوسری طرف یہ مسئلہ بھی ہے کہ نسلی بنیاد پر فسادات نے امریکا کے بہت سے علاقوں کو سخت مشکلات سے دوچار کر رکھا ہے۔

ایک زمانے سے ہم دیکھتے آئے ہیں کہ چین کے حوالے سے معاملات وہ ہوتے نہیں جو دکھائی دیتے ہیں۔ بیشتر معاملات میں ہوتا ہے کچھ اور دکھائی کچھ دیتا ہے۔ چین نے یہ تاثر دے رکھا ہے کہ اس کے ہاں تعلیم، مینوفیکچرنگ اور ٹیکنالوجی کا معاملہ بہت مضبوط ہے یعنی وہ ان تینوں شعبوں میں بہت آگے جاچکا ہے، ایسا نہیں ہے۔ چین اتنا مضبوط نہیں جتنا دکھائی دیتا ہے یا کوشش کرتا ہے کہ دوسروں کو مضبوط دکھائی دے۔ اس حوالے سے بہت سے امریکیوں کے تصوّرات انتہائی بے بنیاد اور کمزور ہیں۔ چین کی بڑھتی ہوئی قوت کے حوالے سے بھی امریکیوں کے ذہن واضح نہیں۔ دکھائی ایسا دیتا ہے جیسے چین نے بیشتر معاملات میں امریکا کو پچھاڑ دیا ہے اور اب وہ واحد سپر پاور کی حیثیت سے سب کچھ اپنے ہاتھ میں لینے والا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجموعی طاقت کے معاملے میں چین اب بھی امریکا سے پیچھے ہے۔ واشنگٹن کے پالیسی ساز اور تجزیہ کاروں کو یہ حقیقت ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ امریکا کے لیے امکانات اُتنے کم نہیں ہوئے، جتنے دکھائی دے رہے ہیں۔

چین کی بڑھتی ہوئی قوت کا طاقت کے افق پر طلوع ہونے کو یوں پیش کیا جاتا ہے کہ گویا یہ تاریخی طور پر کوئی ناگزیر معاملہ ہو۔ یعنی یہ کہ چین کو یوں ابھرنا ہی تھا۔ یہ نکتہ بھی زور دے کر بیان کیا جاتا ہے کہ دنیا بھر میں اپنی بڑھتی ہوئی کمٹمنٹس کے باعث کمزور پڑتا ہوا امریکا ایک ایسی نئی قوت کو راہ دے گا جو منظّم ہو، اپنے آپ کو متحرک رکھنا جانتی اور چاہتی ہو اور اپنے اہداف پر پوری توجہ مرکوز کیے ہوئے ہو۔ اور یہ کہ امریکا بھی بہت جلد تاریخ کی ردّی کی ٹوکری میں جا گرے گا، جیسا کہ برطانیہ اور رومن سلطنت گر گئی تھیں۔ ہیج فنڈ برج واٹر ایسوسی ایٹس کے بانی رے ڈیلیو کی نظر میں چین کا عالمی سطح پر ایک بڑی طاقت کی حیثیت سے ابھرنا ویسا ہی ہے جیسا صنعتی انقلاب کے نتیجے میں یا اس کے بعد برطانیہ کا ابھرنا تھا۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ تاریخی اعتبار سے ایسا ہوتا رہتا ہے۔ ایک قوت کمزور پڑتی ہے تو دوسری اُس کی جگہ لیتی ہے۔ سترہویں صدی عیسوی میں ولندیزی بھی بحری قوت کے طور پر ابھرے تھے اور عالمی سیاست و معیشت میں اپنے لیے بہت سے فوائد کی راہ ہموار کی تھی۔

چین کی پروپیگنڈا مشین یہ تاثر دینے میں مصروف ہے کہ امریکا زوال آشنا ہو چکا ہے۔ اِدھر امریکا کورونا وائرس سے لڑ رہا ہے اور نسلی منافرت بھی عروج پر ہے اور اُدھر بیجنگ کی پروپیگنڈا مشین یہ تاثر مضبوط تر کرنے کی کوشش کر رہی ہے کہ چین نے کورونا وائرس سے نمٹنے کے معاملے میں امریکا کو پچھاڑ دیا ہے۔ ٹرمپ انتظامیہ کے بارے میں چینی پروپیگنڈا مشین تواتر سے کہہ رہی ہے کہ وہ کورونا وائرس سے نمٹنے کی صلاحیت دکھانے میں یکسر ناکام رہی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا جارہا ہے کہ گورننس کے معاملے میں چینی قیادت امریکی جمہوری روایات سے کہیں بہتر اقدار کی حامل ہے۔ سیاہ فام امریکی جارج فلائڈ کی موت کے بعد پھوٹ پڑنے والے نسلی فسادات کے حوالے سے چین کے سرکاری اخبار ''گلوبل ٹائمز'' نے یہ تاثر عام کرنے کی کوشش کی ہے کہ امریکا اب ایک ناکام ریاست ہے۔ مؤرخین، صحافی اور سیاسی تجزیہ نگار امریکا کے زوال کی پیشگوئی عشروں سے کرتے آئے ہیں۔ ۱۹۸۰ء کے عشرے میں صاف دکھائی دے رہا تھا کہ چین دنیا کی سب سے بڑی معیشت ہونے کا اعزاز امریکا سے چھین لے گا۔ جاپان کے لیے ایسا اس لیے ممکن ہوتا دکھائی دے رہا تھا کہ ریاستی پالیسیوں کے تحت معیشت کو کنٹرول کرلیا گیا تھا اور یوں طاقت بڑھ گئی تھی۔ امریکا، آج کی طرح، تب بھی کھلے بازار کی معیشت پر یقین رکھتا تھا۔ جاپان، بہرحال، وہ سب کچھ نہ پاسکا جس کا امکان ظاہر کیا جارہا تھا۔ اس کی معیشت نے ۱۹۹۰ء کے عشرے میں ابھرنے والے مالیاتی بحران سے مکمل طور پر جان چھڑانے میں کامیابی حاصل نہیں کی۔ جن جاپانی کاروباری اداروں

کے بارے میں یہ خیال کیا جارہا تھا کہ وہ دنیا کے کسی بھی بڑے کاروباری ادارے کو پچھاڑ دیں گے، وہ اب کچھ زیادہ کر دکھانے کی حالت میں نہیں۔

ایسے میں سوال یہ ہے کہ چین کیا جاپان سے بڑھ کر کچھ کرسکتا ہے۔ اس حقیقت سے تو خیر انکار نہیں کیا جاسکتا کہ چین کی دولت اور اثر ونفوذ میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ مگر نمبر ون بننے کے لیے بیجنگ کو بہت سی رکاوٹیں عبور کرنا ہوں گی۔ امریکا نے متعدد معاملات میں اپنی برتری برقرار رکھی ہے مگر طاقت کے حوالے سے تجزیہ کرتے وقت ان معاملات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

چین نے کم وبیش چار عشروں کے دوران معیشتی قوت کے حوالے سے اپنی پیش رفت جاری رکھی ہے مگر پھر بھی امریکا نے اپنی برتری سلامت رکھی ہے۔ ۲۰۱۸ء میں امریکی معیشت کا مجموعی ٹرن اوور ۵ء۲۰ کھرب یعنی ۲۰۵۰۰ ارب ڈالر تھا جبکہ چینی معیشت کا ٹرن اوور ۱۳۶۰۰ ارب ڈالر تھا۔ اگر فی کس آمدن یا یافت کے حوالے سے جائزہ لیں تو یہ فرق اور بھی زیادہ ہے۔ یہ اعداد وشمار بھی امریکی برتری کو زیادہ واضح طور پر پیش نہیں کرتے۔ امریکن انٹر پرائز انسٹی ٹیوٹ کے اسکالر ڈیرک سِزرز کہتے ہیں کہ ریئل اسٹیٹ، اسٹاکس اور دیگر اثاثوں کی مجموعی مالیت کے حوالے سے قومی دولت کا موازنہ بہتر ہے کیونکہ یہ سب کچھ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہتا ہے۔ اس تناظر میں دیکھیے تو امریکا بہر حال چین سے زیادہ مال دار اور خوشحال دکھائی دیتا ہے۔ ڈیرک سِزرز نے ایک حالیہ رپورٹ میں بتایا ہے کہ ۲۰۱۹ء کے وسط میں امریکا کی اندرونی آمدن ایک لاکھ ۶ ہزار ارب ڈالر تھی جبکہ چین کے یہی اعداد وشمار ۶۴۰۰۰ ارب ڈالر تک محدود تھے۔

عالمگیر مالیاتی نظام کے حوالے سے بھی چین کی بڑھتی ہوئی قوت امریکا کی پوزیشن کو بہر حال چیلنج نہیں کر رہی۔ چین کی اسٹاکس مارکیٹس اگرچہ وسعت پا رہی ہیں مگر فارن شیئر اونر شپ اور سرحد پار سرمائے کے بہاؤ کو کنٹرول کرنے کے حوالے سے چینی استعداد دکھائی نہیں دیتی۔ کورونا وائرس کے پھیلنے پر عالمی سرمایہ کاروں نے اپنے سرمائے کو محفوظ رکھنے کے لیے چینی بونڈز پر بھروسا کرنا مناسب نہیں سمجھا، ہاں امریکی محکمہ خزانہ کے بونڈز کو انہوں نے ترجیح دی ہے۔ عالمی سطح کی ادائیگیوں کے حوالے سے بھی چین کا شیئر بہت کم ہے۔ چین نے اپنی کرنسی کو عالمی سطح کی کرنسی بنانے کی جتنی بھی کوششیں کی ہیں وہ بہت حد تک نیم دِلانہ ہیں۔

جن معاملات میں چین برتری لیتا ہوا دکھائی دیتا ہے، اُن میں بھی امریکا کی پوزیشن اُتنی کمزور نہیں جتنی دکھائی جاتی ہے۔ ہم یہ بات آسانی سے مان لیتے ہیں کہ امریکا کچھ نہیں بناتا کیونکہ یہ بات پھیلا دی گئی ہے کہ چین سب سے بڑا مینوفیکچرنگ ملک ہے۔ اقوام متحدہ کے جاری اعداد وشمار کے مطابق ۲۰۱۸ء میں مینوفیکچرنگ کے حوالے سے چین کا حصہ ۲۸ فیصد تھا۔ یہ بات زیادہ زور دے کر نہیں بتائی جاتی کہ امریکا کا حصہ ۱۷ فیصد تھا۔ یہ حصہ جرمن فیکٹریز کی مجموعی پیداوار کا تین گنا ہے۔ امریکا انجینئرنگ کے شعبے کی اعلیٰ ترین اشیا تیار کرتا ہے۔ ان میں طیارے اور چپس سبھی کچھ شامل ہے۔ چین اس معاملے میں نقالی کی پوزیشن میں نہیں۔ تجارتی بنیاد پر استعمال ہونے والے طیارے تیار کرنے کے معاملے میں بوئنگ اور ایئربس سے مقابلے کے لیے چین نے بھاری سرمایہ کاری کر رکھی ہے۔ یہ منصوبہ تیکنیکی کمزوری کے باعث کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ چین میں کچھ تیار کرنا بہت آسان اور سستا ہو۔ امریکا اور چین میں فیکٹری چلانے کی لاگت میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ امریکی ورکرز کی پیداوار چینیوں سے زیادہ ہے۔

ٹیکنالوجی کے حوالے سے بھی امریکا غیر معمولی حد تک برتری کا حامل ہے۔ یہ تاثر بھی پایا جاتا ہے کہ امریکا اور چین کے درمیان ''ٹیک وار'' چل رہی ہے۔ بیجنگ کے پالیسی ساز الیکٹرک گاڑیاں بنانے سے 5G ٹیلی کام سسٹم تک کم وبیش ہر تکنیکی شعبے میں مسابقت کے لیے پَر تول رہے ہیں۔ جسے جنگ کہا جارہا ہے وہ اب تک محض جھڑپ کے مرحلے میں ہے۔ ریاستی مشینری کی غیر معمولی مالیاتی مدد کے باوجود چین کے ہائی ٹیک ادارے اب تک امریکا کا سامنا کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔ چین کی سیمی کنڈکٹر فرمز اب تک بہت کمزور ہیں۔ سینٹر فار اسٹریٹجک اینڈ انٹرنیشنل اسٹڈیز نے ایک رپورٹ میں بتایا کہ ہائی ٹیک میں چینی ادارے مکمل خود مختاری اور اعتماد کے ساتھ بے داغ کارکردگی کا مظاہرہ کرنے کی منزل سے بہت دور ہیں۔ امریکا کے ٹیک جائنٹس فیس بک، الفابیٹ اور ٹوئٹر حقیقی معنوں میں عالمگیر نوعیت کے ادارے ہیں۔ دنیا کے ہر گوشے میں اِن کے استعمال کرنے والے موجود ہیں۔ اس کے مقابل چینی ادارے ٹینسنٹ، بائیڈو اور سائنا وائبو اب تک چین کی سرحد ہی سے نکلنے کی تگ ودو میں مصروف ہیں۔

مصنوعی ذہانت کے شعبے میں چین غیر معمولی رفتار سے بڑھ رہا ہے مگر امریکی برتری اب تک سلامت ہے۔ امریکا کے بنائے ہتھیار آج بھی غیر معمولی حد تک کارگر ہیں۔

امریکا کی برابری کرنا چین کے لیے اب بھی بہت بڑا دردِ سر ہے۔ چین میں اعلیٰ تعلیم کا نظام اب تک عالمی معیار کا نہیں۔ یہی سبب ہے کہ چینی طلبہ بڑی تعداد میں امریکی جامعات کا رخ کرتے ہیں۔ دنیا کی بہترین جامعات میں ۵۰ امریکی جامعات کے بعد پیکنگ یونیورسٹی ۹۴ ویں نمبر پر ہے۔ چین کے کالجوں اور جامعات میں طلبہ اور اساتذہ کو کھل کر بولنے اور لکھنے کی آزادی میسر نہیں۔ علمی سطح پر آزادی سے متعلق ایک حالیہ سروے کے مطابق اس معاملے میں کیوبا اور ایران بھی چین سے بہتر ہیں۔

ایک صدی کے دوران دنیا بھر میں متعدد ممالک ابھرے ہیں اور ایک خاص حد تک جاکر ٹھہر گئے ہیں۔ چین کا بھی یہی معاملہ ہے۔ کسی بھی ابھرتی ہوئی معیشت میں جب آمدن ایک خاص حد تک بلند ہو جاتی ہے تب اطمینان کا سانس لیا جاتا ہے اور آگے بڑھنے کے لیے غیر معمولی جدوجہد ترک کر دی جاتی ہے۔ چین میں بھی جدت اور تحقیق وترقی پر غیر معمولی توجہ نہیں دی جاتی، اور ظاہر ہے کہ مطلوبہ فنڈنگ بھی نہیں کی جاتی۔

چین میں بیشتر معاملات اب تک ریاستی کنٹرول میں ہیں۔ ریاست ہی طے کرتی ہے کہ کاروباری ادارے کس طور کام کریں۔ ہوسکتا ہے کہ امریکا میں پالیسی سازوں کو اس بات پر رشک آتا ہو مگر حقیقت یہ ہے کہ ریاستی کنٹرول ہی نے چینی کاروباری اداروں کو بیرون ملک مسابقت کے قابل نہیں چھوڑا۔ چین کی غیر معمولی دولت ناکارہ ریاستی اداروں کا خسارہ پورا کرنے پر ضائع کی جارہی ہے۔ یہی معاملہ اندرونی قرضوں کا بھی ہے۔

یہ کہنا تو سادہ لوحی کا مظاہرہ ہوگا کہ چین کسی بھی حوالے سے امریکا کے لیے بڑا چیلنج نہیں مگر ہاں، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ چین اُتنا بڑا خطرہ نہیں جتنا بنا کر پیش کیا جارہا ہے۔ وہ بہت سے معاملات میں امریکا سے بہت پیچھے ہے۔ امریکا کو ابھی سے پالیسی کے میدان میں ایسی تبدیلیاں لانی چاہییں جو معاملات کو خرابی کی طرف جانے سے روکیں۔

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"Don't believe the China hype".
("defenseone.com", June 16, 2020)

چین کی عسکری سرگرمیاں: امریکا کے لیے پیغام

گزشتہ کچھ ماہ سے جہاں دنیا کورونا کی وبا پر قابو پانے میں مصروف ہے، وہیں چین اپنے ہمسایہ ممالک کے خلاف عسکری کارروائیوں میں مصروف رہا۔ ان فوجی کارروائیوں نے ایشیائی ممالک کے ساتھ ساتھ امریکا میں بھی خطرے کی گھنٹیاں بجائیں۔ جس ہفتے چین اور بھارت کے درمیان سرحدی کشیدگی جاری تھی، اُسی ہفتے ایک چینی آبدوز نے جاپان کی بحری حدود کی خلاف ورزی کی۔ چین کے جنگی طیارے تقریباً روز ہی تائیوان کی فضائی حدود میں دخل اندازی کرتے رہتے ہیں۔ چین کے یہ اقدامات اس کے اعتماد اور فوجی صلاحیتوں کے عکاس ہیں۔ اگرچہ چین کا دعویٰ ہے کہ اس نے یہ اقدامات اپنے دفاع میں کیے ہیں، لیکن ان عسکری کارروائیوں سے خطے میں جنگ کا خدشہ بڑھ رہا ہے۔ ۱۵ر جون کو چینی اور بھارتی فوجیوں کے درمیان ہونے والی جھڑپ ۱۹۶۷ء کے بعد ہونے والی شدید ترین جھڑپ تھی۔

چائنا پالیسی سینٹر کے ڈائریکٹر ایڈم نی کا کہنا ہے کہ خطے کے دیگر ممالک کے مقابلے میں چین کی طاقت میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ اس وجہ سے چین زیادہ آسانی سے اپنے جارحانہ ایجنڈے کو آگے بڑھا رہا ہے۔ اس سال چین کی بڑھتی ہوئی عسکری سرگرمیاں ۱۹۹۰ء کی دہائی میں شروع ہونے والے فوج کی تجدید نو کے پروگرام سے ہوئیں۔ یہ پروگرام چینی سربراہ شی جن پنگ کے دور میں مزید تیز ہوا۔ انھوں نے فوج کے بدعنوان اور کم وفادار افسران کی چھٹی کردی۔ اس کے علاوہ انھوں نے فوج کی توجہ صرف زمینی جنگوں سے ہٹا کر مشترکہ آپریشن کی طرف کردی، جس میں بری، بحری اور فضائی اور خاص طور پر سائبر ہتھیاروں کا استعمال ہو۔ شی جن پنگ نے کورونا کے دوران بھی فوج کو خاص اہمیت دیے رکھی۔ ایک اعلان کے مطابق اس سال چینی فوج کا بجٹ ۶٫۶ فیصد اضافے کے ساتھ تقریباً ۱۸۰ارارب ڈالر ہوجائے گا۔ یہ اعلان ایک ایسے وقت میں سامنے آیا ہے جب چین عالمی معاشی حالات کے سبب اپنے اخراجات کم کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔

ایک عام خیال ہے کہ چینی افواج امریکی افواج کے مقابلے میں بہت پیچھے ہیں، لیکن یہ خیال مکمل طور پر درست نہیں ہے۔ چین اپنی بحری قوت اور خاص طور پر جنگی بحری جہاز اور طیارہ شکن میزائلوں میں امریکا کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ امریکی کانگریس کی رپورٹ کے مطابق اس سال کے اختتام تک چین کے پاس ۳۳۵ بحری جنگی جہاز موجود ہوں گے، جبکہ امریکا کے پاس ۲۸۵ بحری جنگی جہاز ہیں۔ رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ مغربی بحرِاوقیانوس میں امریکی بحریہ کے کنٹرول کے لیے چین اب ایک خطرہ بن گیا ہے۔

چین نے تائیوان کے قریب بھی اپنی سرگرمیاں جاری رکھی ہوئی ہیں۔ اپریل کے مہینے میں چین کا ایک بحری بیڑہ تائیوان کی سمندری حدود کے انتہائی قریب آگیا تھا۔ گزشتہ ماہ چینی جنگی طیاروں نے کئی بار تائیوان کی فضائی حدود میں پرواز کی۔ تجزیہ کاروں کے مطابق یہ تائیوان کے دفاعی نظام کو جانچنے کے لیے کیا گیا تھا۔ اپریل میں ہی چینی کوسٹ گارڈز کے ایک جہاز نے ویتنام کے مچھلی پکڑنے والے جہاز کو ڈبو دیا تھا، اسی ماہ چین کے ایک تحقیقی جہاز نے ایک تیل بردار جہاز کا پیچھا کیا جس کے ردِعمل میں امریکا اور آسٹریلیا نے اپنے چار جنگی جہاز صورت حال پر نظر رکھنے کے لیے روانہ کیے۔ امریکی فضائیہ کے ایک اعلیٰ عہدے دار نے کہا ہے کہ چین نے خطے میں اپنی فضائی سرگرمیاں بھی بڑھادی ہیں۔

حالیہ عسکری کارروائیوں میں چین کی بری فوج اب تک شامل نہیں ہوئی تھی۔ بھارتی فوجیوں کے ساتھ ہونے والی جھڑپ چین کی بری فوج کے لیے امتحان تھا۔ اگرچہ اس جھڑپ کی تفصیلات آزاد ذرائع سے حاصل نہیں ہوسکیں تاہم اس بات کے امکان ضرور ظاہر کیا جارہا ہے کہ اس جھڑپ میں چینی فوجی بھی ہلاک ہوئے ہیں تاہم ان کی تعداد ہلاک ہونے والے بھارتی فوجیوں سے کم تھی۔

اگرچہ بھارت کے ساتھ جاری کشیدگی بھی چین کے لیے اہم ہے، تاہم چینی فوج کی اولین ترجیح چین کے اطراف میں امریکی جارحیت سے نمٹنا ہے۔ امریکا نے بھی اس خطے میں اپنی عسکری کارروائیوں میں اضافہ کردیا ہے۔ امریکا نے تائیوان کی فوجی امداد میں اضافہ کردیا ہے اور ساتھ ہی ساؤتھ چائنا سی میں اپنے جنگی بحری جہاز بھی بھیجے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف چین خطے میں کشیدگی کی ذمہ داری امریکا پر ڈالتا ہے۔ چین کا کہنا ہے کہ امریکا جس خطے میں مداخلت کررہا ہے، وہاں اس کا کوئی حق نہیں ہے۔ ایک چینی تجزیہ کار کا کہنا ہے کہ امریکا میں صدارتی انتخابات قریب آنے کے ساتھ ساتھ امریکی اور چینی افواج کے درمیان تصادم کے امکانات میں بھی اضافہ ہوگا۔ (ترجمہ: محمد عید فاروقی)

"China's military provokes its neighbors, but the message is for the United States". ("nytimes.com". June 26, 2020)

●●●

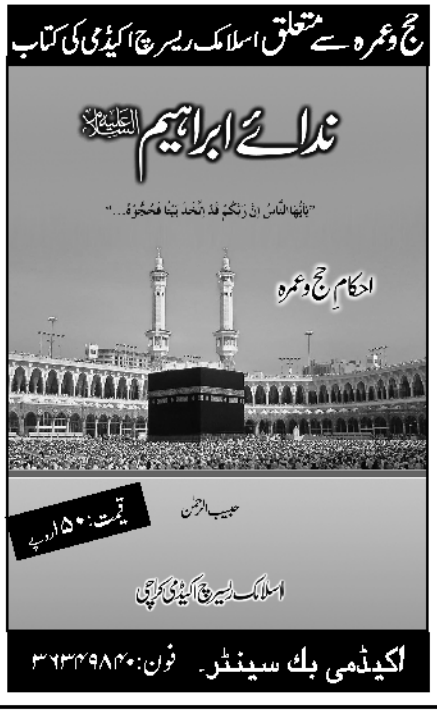

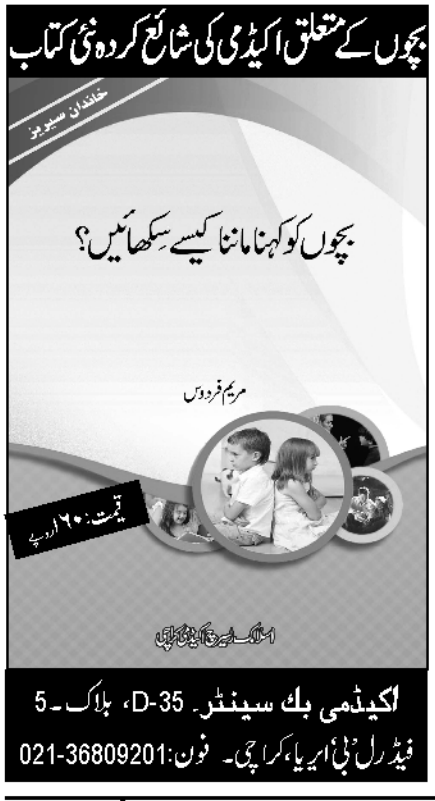

کھلا تنازع، خاموش معاہدہ یا پھر شراکت داری؟

ترکی اور مصر، لیبیا میں آمنے سامنے

Sondos Asem & Ragip Soylu

کھلا تنازع، خاموش معاہدہ یا پھر شراکت داری؟ جیسے جیسے لیبیا کے مرکزی شہر ''سرت'' پر کنٹرول کی جنگ آگے بڑھے گی، مصر اور لیبیا ان تینوں آپشنز میں سے کسی ایک کو اختیار کریں گے۔

گزشتہ برس بھی لیبیا ایک ''پراکسی'' جنگ کے بالکل قریب تھا، جس میں ایک طرف الفرہ تھا تو دوسری طرف مصر، متحدہ عرب امارات اور روس۔

ترک حمایت یافتہ Government of National Accord (GNA) کے ہاتھوں خلیفہ ہفتار کے تر پولی پر حملے کی ناکامی نے مصر کو از سر نو سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس سے پہلے مصر خلیفہ ہفتار کو لیبیا کا ''سیسی'' بنانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

GNA کی مستقل پیش قدمی نے مصری صدر کو جارحانہ پالیسی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ انھوں نے وارننگ دیتے ہوئے کہا ہے کہ تزویراتی شہر ''سرت'' اور ''جفرہ کا ہوائی اڈہ'' قاہرہ کے لیے سرخ لکیر کی حیثیت رکھتا ہے۔

مصر کے صدر سیسی نے لیبیا کے قبائلیوں کی ایک محفل سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''مصر لیبیا کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرنا چاہتا تھا اور وہ اس مسئلے کے سیاسی حل کی حمایت کرتا تھا، لیکن اب صورتحال تبدیل ہو چکی ہے''۔

''اگر لیبیا کے عوام ہم سے مداخلت کی اپیل کرتے ہیں تو یہ بات دنیا کے لیے اشارہ ہے کہ مصر اور لیبیا ایک ہی ملک ہیں اور ان کے مفاد یکساں''۔ اگرچہ یہ بیان نہایت ہی جارحانہ تھا تاہم بہت سے مبصرین نے اسے مصر کے وزیر خارجہ کی پالیسی کا تسلسل ہی قرار دیا ہے۔ مصری وزیر خارجہ نے ایک بیان میں کہا ہے کہ ''صدر کی تقریر کو اعلان جنگ کے معنی دینا غلط ہو گا۔ اس کے علاوہ ترکی نے بھی لیبیا میں موجود شامی ملیشیا اور امریکی حمایت یافتہ مصری فوج سے کسی بھی قسم کی جنگ کے امکان کو مسترد کیا ہے۔ ترک حکام نے شناخت ظاہر نہ کرنے کی شرط پر ''مڈل ایسٹ آئی'' کو بتایا کہ مصر کی دھمکیوں میں کوئی سنجیدگی نہیں لگتی کیوں کہ مصر پہلے ہی ہفتار کی ہر ممکن مدد کر رہا ہے۔

یہ بیان GNA کو جنگ بندی قبول کروانے کے لیے دباؤ ڈالنے کے لیے دیا گیا ہے، جسے روسی حمایت بھی حاصل ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ مصر لیبیا میں اپنی مداخلت کو مزید بڑھانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اسی طرح انقرہ میں واقع تھنک ٹینک کے ماہر Murat Yesiltas نے بھی سیسی کے بیان پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ''مجھے سیسی کے بیانات حقیقت پسندانہ معلوم نہیں ہوتے، یہ بیانات انھوں نے دباؤ بڑھانے کے لیے دیے ہیں نہ کہ وہ واقعی ہی فوجی استعمال کا ارادہ رکھتے ہیں''۔

Murat Yesiltas کا کہنا ہے کہ ''سرت'' اور مصر کے درمیان ۸۰۰ کلومیٹر کا فاصلہ ہے جو کہ مصری فوج کی مداخلت کو تقریباً ناممکن بناتا ہے۔ ان کا مزید یہ کہنا تھا کہ مصر کی سلامتی کو پہلے ہی دو خطرات لاحق ہیں، پہلا جزیرہ نما سینا میں داعش کے حملوں کا خطرہ اور دوسرا ایتھوپیا کی جانب سے Grand Renaissance Dam کی بھرائی کا منصوبہ جس سے دریائے نیل سے مصر کو ملنے والے پانی کے تناسب میں خاصی کمی واقع ہو گی۔

بحیرہ روم میں گیس کی سیاست

اگرچہ کھلی جنگ کے امکانات کم ہیں تاہم بحیرہ روم کے خطے میں ایسے باہمی مفادات موجود ہیں، جو انقرہ اور قاہرہ کو قریب لانے کا باعث بن سکتے ہیں۔ ترکی اور GNA نے نومبر میں ایک معاہدے پر دستخط کیے جس کے تحت مشرقی بحیرہ روم کے ایک حصے کو اسپیشل اکنامک زون میں شامل کر دیا گیا۔

مشرق وسطیٰ کے سیاسی تجزیہ نگار خالد فوا کا کہنا ہے کہ یہ معاہدہ مصر کے لیے دو نئی راہیں کھولنے کا باعث بن سکتا ہے۔ پہلی یہ کہ اس معاہدے کے ذریعے EastMed گیس پائپ لائن کو روکا جا سکے گا، اس پائپ لائن کے ذریعے اسرائیلی گیس کو قبرص اور یونان کے راستے یورپ پہنچایا جانا تھا، اگر یہ پائپ لائن مکمل ہو جاتی تو مصر کو جغرافیائی و سیاسی اور معاشی خطرات کا سامنا کرنا پڑتا۔ کیوں کہ مصر کے دو شہروں میں پہلے ہی سے گیس برآمد کرنے کے حوالے سے تمام انفرااسٹرکچر موجود ہے، اگر EastMed گیس پائپ لائن مکمل ہو جاتی ہے تو مصر کو گیس کی یورپ برآمدگی میں شدید نقصان اٹھانا پڑے گا۔

ویسے تو اس گیس پائپ لائن کے حوالے سے پہلے ہی کافی شکوک و شبہات موجود تھے، ماہرین کا کہنا ہے کہ اس پائپ لائن کے قابل عمل ہونے کے حوالے سے سوالات موجود تھے، کیوں کہ اس گیس پائپ لائن سے جتنی مہنگی گیس ملنی تھی اس سے کہیں کم قیمت پر قطر اور روس یورپ کو گیس فراہم کر رہے ہیں۔ ترکی اور GNA کے اس معاہدے سے اس پائپ لائن کا روٹ بھی تبدیل ہو گا، کیوں کہ ترکی اور لیبیا کی مشترکہ ساحلی پٹی سے اس کا گزرنا ممکن نہیں ہو گا۔

تجزیہ نگار فوا کا کہنا ہے کہ اسی طرح ایک اور معاہدہ یونان کی جانب سے پیش کیا جا رہا ہے جس پر قاہرہ سے بات چیت جاری ہے، لیکن اس معاہدے سے قاہرہ سے زیادہ یونان کو فائدہ ہونا ہے۔ اس معاہدے سے یونان کو اسپیشل اکنامک زون میں مزید جگہ مل جائے گی، جب کہ دوسری جانب قاہرہ کو اضافی پانی بھی ملے گا۔

تجزیہ نگار فوا کا کہنا ہے کہ ۲۰۱۳ء میں فوجی بغاوت کے نتیجے میں سیسی کے برسر اقتدار آنے کے بعد سے مصری حکومت کی سیاسی ترجیحات کا تعین ملکی مفادات سے نہیں ہوتا بلکہ متحدہ عرب امارات اور سعودی عرب کے علاقائی اتحاد کو سامنے رکھ کر کیا جاتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اپنے اقتدار کے آغاز میں سیسی نے مختلف علاقائی اور عالمی اتحاد میں شامل ہونے کی کوشش کی تاکہ انھیں کچھ قانونی حمایت حاصل ہو سکے، کیوں کہ داخلی طور پر ان کے اقتدار کو آئینی اور قانونی جواز تلاش کرنے میں شدید مزاحمت کا سامنا تھا۔

ان نئے اتحادیوں نے سیسی کی حکومت پر کئی فیصلے مسلط کیے۔ ملکی مفادات اور لوگوں کے مطالبات ماننے کے بجائے انھوں نے اپنی حکمرانی کو قانونی جواز فراہم کرنے کے لیے ان ممالک کے فیصلوں کو قبول کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سیسی کبھی بھی ترکی کے ساتھ دوستی کا ہاتھ نہیں بڑھا سکتے کیوں کہ ان پر اتحادیوں کی جانب سے کچھ پابندیاں ہیں اور یہی وہ اتحادی ہیں جو ان کے اقتدار کو برقرار رکھنے کا باعث ہیں۔

بڑھتی ہوئی کشیدگی

انٹرنیشنل کرائسس گروپ کی تجزیہ نگار Claudia Gazzini کا کہنا ہے کہ ترکی اور مصر کے مابین مذاکرات دونوں ممالک کے لیے فائدہ مند ہیں۔ اگر ترکی قاہرہ کو ہتھیار کی ہر ممکن مدد کر رہا ہے۔

مذاکرات کی میز پر لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو درحقیقت اس سے مصر کو زیادہ فائدہ ہوگا کیوں کہ بحیرہ روم کا مزید حصہ اس کے زیر اثر آجائے گا۔

تاہم لیبیا میں انقرہ کی بڑھتی ہوئی جارحیت مصر کے لیے خطرے کا باعث بن رہی ہے۔ ہمارا جو تجزیہ تھا تر کی کی اس سے کہیں زیادہ جارحیت دکھا رہا ہے۔ ترکی کی حد سے بڑھ کر GNA کی حمایت کا بنیادی مقصد بحیرہ روم کے اکنامک زون کی سرحدوں کو اپنی مرضی کے مطابق وسعت دینا ہے۔

Claudia Gazzini کا کہنا ہے کہ ترکی چاہتا ہے کہ GNA لیبیا کی تیل برآمدگی پر اپنا کنٹرول برقرار رکھے اور اس کا بالواسطہ فائدہ ترکی کو ہو، یعنی ترپولی کے اکنامک زون میں اس کی گرفت مضبوط ہو جائے۔ یہ بھی ابھی واضح نہیں ہے کہ کیا سیسی واقعی ہفتار کو چھوڑنے والے ہیں۔ اپریل ۲۰۱۹ء میں جب مشرقی کمانڈ نے ترپولی پر چڑھائی کی تو مصر نے بڑے پیمانے پر ہفتار کی مدد کی تھی تاکہ وہ ان کی پیش قدمی کو روک سکے۔

مصر شائد ترکی سے بات چیت پر تو راضی ہو جائے لیکن وہ کسی صورت یہ نہیں چاہے گا کہ ترکی مشرق کی جانب مزید پیش قدمی کرے، مصر کی خواہش ہے کہ لیبیا میں بھی ایک سیسی حکومت کرے، جو کہ مصر کے مفادات کو پورا کرتا رہے۔

دوسری جانب ترکی مصر سے دوستی اور شراکت داری کا کوئی خاص خواہش مند نہیں ہے۔ انقرہ میں سیسی کو اب بھی ایک آمر کے طور پر لیا جاتا ہے۔ اس لیے یہ بہت مشکل ہوگا کہ دونوں ممالک کے تعلقات بہتری کی جانب بڑھیں۔

توانائی کے معاملے میں کسی بھی قسم کی شراکت داری سے پہلے ضروری ہے کہ دونوں ممالک کے سفارتی تعلقات میں بہتری آئے۔

(ترجمہ: حافظ محمد نوید نون)

"Conflict, partnership, stalemate: Egypt and Turkey's Libya options". ("middleeasteye.net". June 24, 2020)

●●●

نیتن یاہو اور 'گریٹر اسرائیل' کا خواب

شاہ زیب جیلانی

بینجمن نیتن یاہو 'گریٹر اسرائیل' کے خواب کی تکمیل کے لیے جلد مشرق وسطیٰ کا نقشہ بدلنے جا رہے ہیں اور بظاہر دنیا یہ سب ہوتا دیکھتی رہ جائے گی۔

اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل انٹونیو گوٹیریش کے مطابق اسرائیل کی طرف سے غرب اردن کا یکطرفہ الحاق ''بین الاقوامی قانون کی سب سے سنگین خلاف ورزی ہوگی''۔ مسلم دنیا اور یورپی ممالک بھی فلسطینی غرب اردن کو زبردستی ہتھیانے کے اسرائیلی منصوبے کی مذمت اور مخالفت کر چکے ہیں۔ لیکن اس کا کوئی اثر نہیں ہوا کیونکہ وزیر اعظم نیتن یاہو کو اس انتہائی متنازع اقدام کے لیے امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی پشت پناہی حاصل ہے۔

مشرق وسطیٰ کے مبصرین اس بات پر متفق ہیں کہ نیتن یاہو طاقت کے زور پر جو کچھ کرنے جا رہے ہیں اس کے خطے کے امن و استحکام پر گہرے منفی اثرات پڑیں گے۔

لوگ نہیں، زمین چاہیے!

نیتن یاہو غرب اردن کا اسرائیل کے ساتھ زبردستی الحاق کرنے کے بعد اگر فلسطینیوں کو وہاں سے بے دخل کر سکتے تو شاید کر دیتے، لیکن ایسا ممکن نہیں۔ غرب اردن میں فلسطینیوں کی تعداد کوئی پچیس لاکھ ہے۔ اسرائیل کا حصہ بننے کی صورت میں فلسطینی اسرائیلی آبادی کا چالیس فیصد ہو جائیں گے۔

نیتن یاہو چاہیں تو انہیں اسرائیلی شہریت دے کر برابری کے حقوق کا وعدہ کر سکتے ہیں لیکن ایسا کرنے سے اسرائیل میں فلسطینیوں کی تعداد بڑھ جائے گی، جس سے یہودی اکثریت کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے نیتن یاہو فلسطینیوں کو بطور شہری برابر کے حقوق دینے کے بھی خلاف ہیں۔ لیکن اگر اسرائیل نے فلسطینیوں کو اپنے ہی علاقے میں دوسرے درجے کا شہری بنانے کی کوشش کی تو اس سے غم و غصہ بڑھے گا۔

جنوبی افریقا میں سفید فام اقلیت نے ایک عرصے تک مقامی سیاہ فام آبادی پر اسی طرح حکومت کی اور اس کا استحصال کیا۔ لیکن وہاں کے لوگوں کی جدوجہد اور عالمی دباؤ کے بعد بالآخر اس نظام کا خاتمہ ہو گیا۔ اسرائیل کے لیے آج کے دور میں اسی طرح کا امتیازی نظام متعارف کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوگا۔ اس روش کے آگے جا کر خطرناک نتائج بھی نکل سکتے ہیں۔

فرق کیا پڑے گا؟

فوری طور پر شاید کوئی شدید ردعمل سامنے نہ آئے۔ عرب حکمران اور دیگر ملک فلسطینیوں کے ساتھ ہمدردی دکھانے کی خاطر زبانی کلامی اسرائیل کی مذمت کریں گے، لیکن عملی طور پر دنیا نے بظاہر فلسطینیوں کو اب ان کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ بیشتر ممالک سمجھتے ہیں کہ اس مسئلے پر امریکا اور اسرائیل کے ساتھ ایک حد تک ہی محاذ آرائی کی جا سکتی ہے لیکن فلسطینیوں کی خاطر ان سے لڑائی نہیں کی جا سکتی۔ خود فلسطینی قیادت اتنی مایوس ہے کہ اس کا کہنا ہے کہ وہ اس کی سخت مخالفت کرے گی لیکن اسرائیل کے خلاف پرتشدد مظاہروں کی حمایت نہیں کرے گی۔

داؤ پر کیا ہے؟

امریکا سمیت عالمی برادری نوے کی دہائی سے اوسلو معاہدے کے تحت خطے میں دو ریاستوں کے قیام کے لیے کوشاں رہی ہے۔ لیکن دنیا کی نظر میں نیتن یاہو کا یہ اقدام فلسطینیوں کا اپنی علیحدہ ریاست کا دیرینہ خواب چکنا چور کرنے کے مترادف ہے۔

نیتن یاہو اور ان کے حمایتیوں کے نزدیک غرب اردن کا علاقہ یہودی عقیدے کے اعتبار سے اسرائیل کا اٹوٹ انگ ہے اور ملک کی سلامتی کے لیے بھی ناگزیر ہے۔ لیکن دنیا کے نزدیک اسرائیل نے ان علاقوں پر ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد سے قبضہ کر رکھا ہے۔

پچھلی چند دہائیوں میں اسرائیل ان مقبوضہ علاقوں میں ''نئے زمینی حقائق'' قائم کرنے کی پالیسی پر گامزن رہا ہے، جس کے تحت وہاں مسلسل نئے گھر اور فلیٹ تعمیر کر کے باہر سے یہودی خاندانوں کو لا لا کر بسایا جاتا رہا ہے۔ عالمی برادری کی نظر میں یہ تعمیرات غیر قانونی ہیں۔ اس کے باوجود آج غرب اردن کی ان شاہکار بستیوں میں کوئی پانچ لاکھ کے قریب اسرائیلی یہودی بستے ہیں۔

نیتن یاہو کا خیال ہے کہ وہ طاقت کے بل پر 'گریٹر اسرائیل' کے خواب کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن دنیا کی نظر میں ان کا یہ عمل خطے کو تباہی اور جنگ کی طرف دھکیل رہا ہے۔

(بحوالہ: ''ڈی ڈبلیو ڈاٹ کام''۔ ۳۰ جون ۲۰۲۰ء)

●●●

بھارت کا دیوقامت دفاعی بجٹ

فرخندہ اقبال

"جس طرح پہلے امریکی رہنماؤں نے منرو ڈاکٹرائن (Monroe Doctrine) میں مغربی نصف کرۂ ارض میں امریکا کے خصوصی کردار کا تصور پیش کیا تھا، اسی طرح بھارت نے بحر ہند کے خطے میں ایسٹ انڈیز اور ہارن آف افریقا کے درمیان عملی طور پر ایک خصوصی پوزیشن قائم کر لی ہے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں یورپ میں برطانیہ کی طرح، بھارت کرہ ارض کے اس وسیع خطے میں کسی غالب طاقت کے ظہور کو روکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جس طرح پہلے امریکی رہنماؤں نے منرو ڈاکٹرائن میں مغربی نصف کرۂ ارض کے ممالک کی رضامندی کی کوشش نہیں کی تھی، اسی طرح بھارت نے اپنے خصوصی تزویراتی مفادات والے خطے میں ساؤتھ ایشین آرڈر کی اپنی اصطلاح کی بنیاد پر اپنی پالیسی اختیار کی ہوئی ہے"۔ (ہنری کسنجر)

بھارت کے دفاعی بجٹ اور فوجی اخراجات نے پچھلے کئی برسوں سے پوری دنیا کی توجہ حاصل کر رکھی ہے۔ ہر سال جب بھی بھارتی حکومت دفاع کے نام پر اربوں ڈالر مختص کرتی ہے تو دنیا بھر کے تھنک ٹینکس اس کا نہایت دلچسپی اور مختلف زاویوں سے بغور جائزہ لیتے ہیں۔

اس مرتبہ بھی جب بھارت کی وزیر خزانہ نرملا ستھرامن نے سال ۲۱-۲۰۲۰ کے لیے ۶۵،۸۷ بلین ڈالر (۴،۷۱،۳۷۸ کروڑ روپے) کا دیوقامت دفاعی بجٹ پیش کیا۔ اور اس طرح کل بجٹ میں پچھلے سال کی نسبت ۲۱،۳۶۷،۴۰ کروڑ روپے کا اضافہ کیا گیا، دفاعی ماہرین کے مطابق بھارت نے اپنے بجٹ میں دفاع کے لیے اصل مختص رقم سے کئی گنا کم رقم ظاہر کی ہے۔ کیونکہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ بھارتی حکومت اپنی ویب سائٹس پر جو دفاعی بجٹ ظاہر کرتی ہے، اس میں پھر چپکے سے "نظر ثانی شدہ بجٹ" اور "اصل اندازوں" کے نام پر بڑے اضافے کیے جاتے ہیں جو عالمی میڈیا میں رپورٹ نہیں ہوتے۔

ابھی یہ بحث جاری تھی کہ ۲۸ ر اپریل کو اسٹاک ہوم انٹرنیشنل پیس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (سپری) نے اپنی سالانہ رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا کہ بھارت گزشتہ برس امریکا اور چین کے بعد دنیا میں تیسرا بڑا فوجی بجٹ مختص کرنے والا ملک رہا، جس کے فوجی اخراجات ۷۱ء۱ بلین ڈالر تک پہنچ گئے ہیں۔ اس میں ۱۹۹۰ء سے ۲۰۱۹ء تک پچھلے ۳۰ برسوں میں ۲۵۹ فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔

بھارت کے دفاعی اخراجات اور مختلف ممالک کے ساتھ ہتھیاروں کے معاہدوں پر عالمی میڈیا میں بحث تقریباً سال بھر چلتی رہتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ آخر اس شعبے میں اتنی تگ و دو کیوں کر رہا ہے اور اس پر ہتھیاروں اور اسلحے کے ڈھیر لگانے کا اتنا جنون کیوں سوار ہے؟ اس کا جواب ڈھونڈنے کے لیے ہم بھارتی حکمت عملی کا تین زاویوں سے جائزہ لیں گے۔ (۱) جنگجویانہ خارجہ پالیسی، (۲) اشتعال انگیز دفاعی پالیسی اور (۳) پہلی دونوں پالیسیوں کو مدد دینے والی اقتصادی پالیسی۔

بھارت کی خارجہ پالیسی کے متعلق بھارتی اسکالر راج موہن لکھتے ہیں، "بھارت کی وسیع حکمت عملی دنیا کو تین دائروں میں تقسیم کرتی ہے۔ پہلے دائرے میں، جو قریب ترین پڑوسیوں پر محیط ہے، بھارت برتری اور بیرونی طاقتوں کے اقدامات کو ناکام بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

دوسرے دائرے میں جہاں ایشیا اور بحر ہند کے ساحل پر پھیلے نام نہاد قدرے دور کے پڑوسی شامل ہیں، بھارت دوسری طاقتوں کے ساتھ توازن قائم کرنے اور انھیں اپنے مفادات کو نقصان پہنچانے سے روکنے کے لیے کوشاں رہتا ہے۔

تیسرے دائرے میں، جس میں پوری دنیا شامل ہے، بھارت بڑی طاقتوں میں سے ایک کا مقام پانا چاہتا ہے جو عالمی امن وسلامتی میں ایک اہم کھلاڑی ہو"۔

ہم اگر ایشیا میں بھارتی خارجہ پالیسی کا جائزہ لیں تو وہ اپنے تمام پڑوسیوں کے ساتھ کسی نہ کسی محاذ آرائی میں مصروف ہے۔ اس نے اپنے قیام کے فوری بعد حیدر آباد دکن، سکم، گوا اور جوناگڑھ کا الحاق کیا اور پھر مقبوضہ کشمیر کو ہڑپ کر لیا۔ اس کی پاکستان کے ساتھ ۱۹۴۸ء، ۱۹۶۵ء، ۱۹۷۱ء، ۱۹۹۹ء کی جنگوں سمیت کئی چھوٹی بڑی جھڑپیں ہو چکی ہیں اور یہ ابھی تک لائن آف کنٹرول پر امن کو تہہ و بالا کیے ہوئے ہے۔ اس نے چین کے ساتھ ۱۹۶۲ء میں جنگ لڑی اور اب بھی سرحدی تنازع رکھتا ہے۔

۲۰۱۷ء میں ڈوکلام کشمکش میں ہزیمت اٹھانی پڑی لیکن پھر بھی سرحدی جھڑپوں میں مصروف ہے، جس میں تازہ ترین جھڑپ ۱۰ مئی کو ہوئی ہے۔ بھارت نے ۱۹۸۰ء کی دہائی میں سری لنکا میں فوجی مداخلت کی تھی۔ ۱۹۸۸ء میں مالدیپ کے سیاسی معاملات میں بھی ٹانگ اڑائی۔ بھارت نے اس کے علاوہ بھوٹان میں اپنے مستقل فوجی تعینات کیے ہیں۔ جبکہ پاکستان، بنگلا دیش اور نیپال کے ساتھ سرحدی تنازعات بھی رکھتا ہے۔

بھارت کی خارجہ پالیسی میں جارحیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے ایک ماہ کے اندر اندر مئی میں پاکستانی علاقوں گلگت بلتستان اور آزاد کشمیر کو اپنی نیوز بلیٹن کا حصہ بنایا، چین کے ساتھ سرحدی تصادم کیا، جس میں دونوں جانب کے متعدد فوجی اہلکار زخمی ہوئے اور اس نے چین کے مقام منسارو ور (Manasarovar) تک سڑک بنانے کے لیے نیپالی علاقے لپولیخ (Lipulekh) پر قبضہ کرنے کی کوشش کی جہاں سے یہ سڑک گزرنا چاہتا ہے، اس پالیسی پر نیپال نے شدید ردعمل دکھایا ہے۔

امریکا کے سابق نیشنل سیکورٹی ایڈوائزر زبگنیو برزینسکی (Zbigniew Brzezinski) اپنی کتاب "اسٹریٹجک وژن: امریکا اینڈ دی کرائسس آف گلوبل پاور" میں لکھتے ہیں،

"بھارتی حکمت عملیاں ایران سے لے کر تھائی لینڈ تک کے علاقے میں گریٹر بھارت کی پوزیشن کا کھلا اظہار ہیں۔ بھارت بحر ہند پر فوجی کنٹرول حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ قریبی ممالک بنگلا دیش اور برما میں مضبوط ٹھکانے قائم کرنے کے لیے سیاسی کوششوں کی طرح اس کے بحری اور فضائیہ کے پروگرام اس رجحان کی جانب واضح اشارہ کرتے ہیں"۔

بھارتی دفاعی پالیسی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی حکومت نے مختص سالانہ دفاعی بجٹ کے علاوہ تینوں سروسز چیفس کو فوجی ساز و سامان حاصل کرنے کے لیے پانچ سالہ ماڈل منصوبہ تشکیل دینے کی ہدایت کی ہے۔ بھارتی بحریہ ۲۰۲۷ء تک ۲۰۰ جہازوں پر مشتمل بیڑہ حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اس کی کوشش ہے کہ چھ نئی آبدوز اور ۱۱۱ ریٹیول یوٹیلٹی ہیلی کاپٹر کا حصول ممکن بنائے۔ بھارت ۲۰۱۵ء میں ۳۶ رافیل طیاروں کا آرڈر دینے کے علاوہ ۱۱۴ نئے لڑاکا طیارے بھی حاصل کرنے کی کوشش میں ہے۔ بھارت فوجی ٹیکنالوجی

درآمد کرنے کے لیے کئی ممالک سے معاہدے کر رہا ہے۔
اکتوبر ۲۰۱۹ء میں پینٹاگان نے کہا تھا کہ واشنگٹن اور دہلی کے درمیان دوطرفہ دفاعی تجارت سال کے اختتام تک ۱۸ بلین ڈالر تک پہنچنے کا امکان ہے۔ اسی سال امریکی محکمہ خارجہ نے کہا تھا کہ وہ بھارت کو ۲.۶ بلین ڈالر کے عوض ایم ایچ ۶۰-آر سی ہاک ہیلی کاپٹر، ۳.۳ بلین ڈالر مالیت کے اپاچی ہیلی کاپٹر، ۳ بلین ڈالر کے پی-۸ آئی میری ٹائم پیٹرول ائیرکرافٹ اور ۳.۷۷ بلین ڈالر کے ایم ۷۷۷ ہاوٹزر فروخت کرے گا۔ اس کے بعد فروری ۲۰۲۰ء میں امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے دورہ بھارت کے دوران دونوں ممالک کے درمیان ۳ بلین ڈالر کا دفاعی معاہدہ ہوا۔ اس معاہدے کے تحت امریکا بھارتی فوج کو ہیلی کاپٹر اور دیگر فوجی سازوسامان فراہم کرے گا۔ اس کے علاوہ رواں سال کے اوائل میں امریکا نے بھارت کو Integrated Air Defence Weapon System (IADWS) کی فروخت کی منظوری دی تھی، جس کی مالیت ۱.۸۷ بلین ڈالر ہوگی۔ اس نظام میں لانچر، ٹارگٹنگ اینڈ گائیڈنس سسٹمز، درمیانی فاصلے کے فضا سے فضا تک مار کرنے والے جدید میزائل (AMRAAM) اور اسٹنگر میزائل، تھری ڈی سینٹنل ریڈارز، فائر ڈسٹری بیوشن سنٹرز اور کمانڈ اینڈ کنٹرول یونٹس شامل ہوں گے۔ ہر وقت جنگ کے لیے تیار رہنے والے بھارت کے دارالحکومت دہلی کے لیے ایک فضائی دفاعی منصوبہ بنایا جا رہا ہے جس میں کئی پرتوں کا حامل میزائل دفاعی نظام قائم کیا جائے گا۔

اس نظام میں اندرون دہلی کی حفاظت National Advanced Surface to Air Missile System کے ذریعے کی جائے گی۔ اس کے اوپر آکاش دفاعی میزائل نظام نصب کیا جائے گا جس کی رینج ۲۵ کلومیٹر تک ہوگی۔ اکتوبر ۲۰۲۰ء سے اپریل ۲۰۲۳ء کے درمیان حاصل کیے جانے والے روسی ساختہ ایس ۴۰۰ میزائل نظام دوسری پرت بنائے گا، جس میں ۱۲۰، ۲۰۰، ۲۵۰ اور ۳۸۰ کلومیٹر تک مار کرنے والے میزائل شامل ہوں گے۔ اگلی پرت میں اسرائیل کے اشتراک سے بنائے گئے زمین سے فضا تک درمیانی فاصلے تک مار کرنے والے براک-۸ میزائل نصب کیے جائیں گے۔ ایڈوانسڈ ائیر ڈیفنس (اے اے ڈی) اور پرتھوی ائیر ڈیفنس (پی اے ڈی) انٹرسیپٹر میزائل دہلی کے میزائل شیلڈ کی سب سے بیرونی پرت میں نصب کیے جائیں گے۔

بحرہند کی تزویراتی اہمیت کے بارے میں امریکی بحریہ کے ایڈمرل الفرڈ ٹی۔ ماہن نے کہا تھا کہ ''جس کسی نے بھی بحرہند میں میری ٹائم برتری حاصل کرلی وہ عالمی منظرنامے پر ایک بڑا کھلاڑی بن جائے گا''۔ اور بھارت اس شعبے میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہنا چاہتا۔ بھارتی بحریہ کا آبدوز بیڑہ نیوکلیئر بیلسٹک میزائل آبدوز (ایس ایس بی این) آئی این ایس، چار فرانسیسی ساختہ سکورپین کلاس آبدوزوں اور روس سے حاصل کی گئیں اکولا کلاس آبدوزوں پر مشتمل ہے، لیکن وہ اس میں مسلسل اضافہ کر رہا ہے۔ اس وقت بحرہند میں بھارت کے لگ بھگ ۱۴۰ جنگی جہاز لنگرانداز ہیں اور وہ ۲۰۲۷ء تک یہ تعداد ۲۰۰ تک بڑھانے کے لیے کوشاں ہے۔ بھارت خطے میں اپنا اثرورسوخ بڑھانے کے لیے بحرہند میں مختلف طریقوں سے اپنی طاقت بڑھانے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ بحرہند کے ممالک سری لنکا، مالدیپ، ماریشیس اور سے شلز میں چین کے اثرورسوخ کو قابو کرے، کیونکہ ان ممالک میں اپنی پوزیشن مضبوط کرنے سے وہ ان کے پانیوں میں کاروباری مقاصد کے لیے استعمال ہونے والے راستوں تک چین کی رسائی محدود کرنے کی پوزیشن میں آجائے گا اور اس سے جڑے اپنے مفادات حاصل کرسکے گا۔ بھارت انڈیمان اور نکوبار جیسے جزائر پر اپنے فوجی انفراسٹرکچر کو مضبوط کر رہا ہے، یہ جزیرے آبنائے ملاکا تک ہونے والے بحری سفر پر نگاہ رکھنے کے لیے عمدہ جگہیں ہیں۔ بھارت نے یہاں بڑے سمندری گشتی طیاروں کے لیے وسیع میدان قائم کرنے کے ساتھ ساتھ اسلحے کے گودام بنائے ہیں اور بڑے جہازوں کے لیے لنگراندازی کی بہترین سہولت کا بندوبست کرلیا ہے۔ بھارتی افواج بحرہند میں امریکا کے ساتھ Communications, Compatibility and Security Agreement کے تحت امریکی فوج کے ساتھ سمندر میں مشترکہ آپریشنز اور سالانہ مشقیں کرتی ہیں۔ بھارت اور امریکا دونوں اس سمندر میں چین کا اثرورسوخ محدود کرنے کا مشترکہ مقصد رکھتے ہیں اور بھارت بحرہند میں چین کی سرگرمیوں کا توڑ کرنے کے لیے بحیرہ جنوبی چین میں 'ایکٹ ایسٹ' پالیسی کے تحت چین کے خلاف اپنا اثرورسوخ بڑھا رہا ہے۔

اقتصادی شعبے میں دیکھا جائے تو بھارت چین کے منصوبے Belt and Road Initiative (BRI) کی مخالفت کرتا رہا ہے، لیکن اب وہ اس کے خلاف قائم ہونے والے نئے محاذ کا بھی رکن بن گیا ہے۔ نومبر ۲۰۱۹ء میں تھائی لینڈ کے شہر بنکاک میں آسٹریلیا، امریکا اور جاپان نے بلیو ڈاٹ نیٹ ورک (بی ڈی این) کے قیام کا اعلان کیا۔ امریکا کی سربراہی میں شروع ہونے والے اس منصوبے کا مقصد یہ ہے کہ مختلف بڑی بین الاقوامی کمپنیوں کی جانب سے چین میں ہونے والی سرمایہ کاری کو وہاں سے اٹھا کر نئے صنعتی مراکز میں لایا جائے، جس کے لیے زمین بھارت فراہم کرے گا۔ اس نے ملک کے مختلف علاقوں میں بی ڈی این منصوبے میں امریکا کو ۴،۶۱،۵۸۹ ہیکٹر زمین کی پیشکش کی ہے۔ یہ چین کے صنعتی مراکز کو تباہ کرنے کی ایک بہت جارحانہ کوشش ہے۔ اب بھارت اقتصادی میدان میں بھی چین کے مفادات سے براہ راست ٹکرا رہا ہے۔

بھارت کی جنگجویانہ خارجہ پالیسی، دفاعی اور اقتصادی پالیسیوں کا جائزہ لینے کے بعد ہر سال تیزی سے بڑھتے ہوئے اس کے فوجی اخراجات کا مقصد واضح ہوجاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ بھارت ہر صورت میں ایشیا کا ٹھیکیدار بننا چاہتا ہے اور اس کے لیے مختلف محاذوں پر سرگرم ہے۔ بھارت کو اندازہ ہے کہ اس کی اشتعال انگیز پالیسیاں کسی بھی وقت خطے میں جنگ چھیڑ سکتی ہیں اور اس وجہ سے وہ ہتھیاروں کے انبار لگا کر ہر وقت بڑی جنگ کے لیے تیار رہنے کی کوششوں میں مگن ہے۔

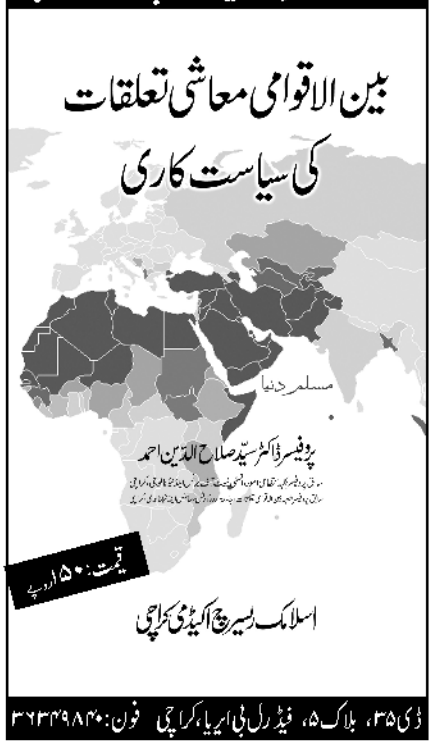

(بحوالہ: "hilal.gov.pk")

●●●

ترکی کا مثالی کتاب کلچر

ڈاکٹر عمیر انس

ہندوستان اور ترکی کے مصنفین میں فرق محض اتنا ہے کہ ہندوستان کے مصنفین اگر اردو، عربی اور فارسی میں لکھنے والے ہیں تو وہ تقریباً یتیم ہیں، کیوں کہ نہ ان کے لکھنے کی حوصلہ افزائی کرنے والا کوئی ہے اور نہ ان کو ان کی تحریروں کا مناسب معاوضہ ملتا ہے۔ اردو صحافت کو اپنی روزی روٹی بنانا ہر کسی کے بس میں نہیں ہے۔ خوشی ہے کہ ترکی زبان میں لکھنے والوں کو اس احساس سے نہیں گزرنا پڑتا، خواہ وہ کیسا بھی لکھیں حکومت کی طرف سے مصنفین کی حوصلہ افزائی بھی ہوتی ہے اور پبلشرز کی طرف سے مناسب مالی معاوضہ اور مقابلے کے میدان میں برابر کی حصہ داری بھی ملتی ہے۔ ترکی میں آئی ایس بی این نمبر کے ساتھ ۲۸۰۰۰ کتابیں شائع ہوئیں، اس میں ۱۴ فیصد کتابیں صرف بچوں کے لیے شائع ہوئیں، ۱۶ فیصد اکیڈمک کتابیں اور ۳۲ فیصد تعلیمی کتابیں تھیں، تعداد اشاعت کے اعتبار سے گزشتہ سال ۵۸ کروڑ کی تعداد میں کل کتابیں شائع کی گئی ہیں، یعنی ہر شہری پر سات کتابیں پرنٹ ہوئیں۔ یہ سارے اعداد و شمار ترکی کی وزارتِ اعداد و شمار نے جاری کیے ہیں۔ جی ہاں یہ سارے اعداد و شمار پابندی سے جمع کیے جاتے ہیں اور عوام کو بتائے جاتے ہیں، اس اعتبار سے ترکی دنیا میں گیارہویں نمبر پر ہے، جب کہ ہندوستان ساتویں، ایران دسویں، مصر چالیسویں، سعودی عرب ۵۴ ویں اور پاکستان ۵۵ ویں نمبر پر ہے، ابتدائی دس میں ایران کے علاوہ اور کوئی مسلم ملک نہیں ہے۔

دِلّی میں کتابیں خریدنے کا تجربہ دوسرا ہے، وہاں لینڈ مارک کے علاوہ ایسا کوئی کتاب گھر نہیں، جہاں ایک ہی چھت کے نیچے اتنے سارے موضوعات پر کتابیں موجود ہوں، لیکن ترکی میں کتابیں فروخت کرنے والی کمپنیوں میں دوست، کتاب ایوی، پنڈورا، ڈی اینڈ آر، ریمزی کتاب ایوی سمیت کئی مقامی کمپنیاں اور دکانیں ہیں، جن کے ہر شہر میں بڑے بڑے مراکز ہیں۔ مثال کے طور پر انقرہ کے رمزی کتاب ایوی میں تو قارئین کے لیے باقاعدہ ایک چائے خانہ بھی ہے۔ یورپ کا سب سے بڑا کتاب گھر BKM دو سال پہلے بورصہ شہر میں کھولا گیا ہے، جو پانچ ہزار اسکوائر میٹر پر واقع ہے اور ۵۰ لاکھ سے زائد کتابیں اور اسٹیشنری کا سامان رکھا گیا ہے۔ استنبول میں قدیم کتابیں اور تاریخی مخطوطات کی دکانوں کا ایک الگ ہی جنون ہے۔ استنبول میں دنیا بھر سے antique سامان کے شوقین آتے ہیں، یہ دکانیں بہت مہنگے داموں پر اہم تاریخی سامان فروخت کرتی ہیں۔ اسی طرح سے قدیم ایڈیشن خریدنے والوں کا ایک بڑا طبقہ ہے، جن کے لیے نادر کتابوں کی دکانیں ہیں۔ میں نے دو سال پہلے ترکی ادبیات پر ۱۹۳۳ء کا ایڈیشن موجود ایڈیشن سے تین گنا زیادہ قیمت پر خریدا۔ یاد آیا کہ ہندوستان میں میرے والد صاحب کے انتخاب میں بھی معارف، اصلاح، زندگی نو اور الفرقان کے ۱۹۵۰ء کے نسخے موجود ہیں۔ مولانا ندوی کو مولانا مودودی کے سفر شام میں ان کی تقریر کا عربی ترجمہ کرنا کتنا ناگوار گزرا تھا یہ بات مولانا ندوی کے ''الفرقان'' میں شائع شدہ سفرنامے سے معلوم ہوئی۔ نہیں معلوم کہ مولانا کے کتابی نسخے میں یہ تذکرہ موجود ہے یا نہیں۔ میں بہت دنوں سے علامہ شبلی نعمانی کے سفر ترکی سے متعلق مضامین اس زمانے کے عثمانی رسائل میں تلاش کر رہا ہوں، ابھی تک کوئی بڑی کامیابی نہیں ملی ہے۔ علامہ شبلی کی بعض کتابوں کا ترجمہ عمر رضا دوگرول نے بہت پہلے ہی کر دیا تھا اور بعد کے ایام میں ترکی کے ندوی عالم دین یوسف قراچا نے ان کا سفرنامہ اور امام غزالی کا ترجمہ کیا ہے۔ علامہ شبلی نے ۱۸۹۰ء میں استنبول کے علمی حالات کا مختصر تذکرہ کیا ہے اور استنبول کے کتب خانے، قہوہ خانوں میں علمی مجلّے اور مدارس اور طلبہ کی کثرت سے مولانا کو بہت خوشی محسوس ہوئی، اس کو آج کل پھر سے محسوس کیا جاسکتا ہے۔

کتابوں کی اشاعت کے ساتھ ساتھ کتابوں کے مطالعے کا رجحان بھی مسلم ممالک میں شاید سب سے بہتر ترکی میں ہی بڑھا ہوگا، حالانکہ ذوق مطالعہ کے سلسلے میں مَیں نے جرمنوں کو ہی اب تک سب سے بہتر پایا ہے۔ مَیں نے جرمنی میں قیام کے دوران لوگوں کو ٹرینوں، بسوں، پارکوں یا عام جگہوں پر بیٹھ کر کتابیں پڑھتے دیکھا ہے، اس کا کچھ اثر ترکی پر بھی ہوا ہے، کیونکہ ترکی اور جرمنی کے تعلقات عثمانی زمانے سے ہی مضبوط رہے ہیں اور فی الحال تقریباً تیس لاکھ ترک جرمنی میں مقیم ہیں۔ عثمانی رسائل میں بھی یورپی ادب کا ترجمہ بڑے پیمانے پر شروع ہوگیا تھا۔ ایک خاص کلچر جو یورپ میں بھی عام نہیں ہے، وہ ہے قرأت خانوں کا کلچر۔ ہر شہر میں ایک لائبریری اور چائے کی دکان کو ملا کر قرأت خانے قائم کیے گئے ہیں۔ سبھی تنظیمیں، پارٹیاں، کلچرل گروپس اور کمرشل گروپس بھی اس طرح کے قرأت خانے کھولتی ہیں، لیکن ان کا مقصد کمرشل بالکل نہیں ہے، اس لیے چائے اور دیگر کھانے کے سامان بے حد مناسب داموں میں دستیاب ہیں۔ مَیں اب تک ایسے متعدد قرأت خانوں میں جا چکا ہوں، کوئی سیکولر حضرات کا ہے تو کوئی دین پسند افراد کا، کچھ این جی اوز سے وابستہ ہیں تو کچھ تعلیمی اور تحقیقی اداروں سے۔ آپ یہاں ہر روز کوئی نہ کوئی گروپ ڈسکشن ہوتا دیکھ سکتے ہیں۔ میرے جانے کی پہلی وجہ ترکی زبان سیکھنے کے لیے غیر ملکی زبانیں سیکھنے والے گروپ میں شرکت تھی، جہاں میں عربی اور انگریزی سکھانے کے بدلے ترکی زبان سیکھنے جاتا تھا۔ ایک گروپ قرآن اسٹڈیز کا آتا ہے، ایک گروپ سیاسی علوم کا آتا ہے، ہر ملک کے طلبہ نے اپنی ملاقات کا وقت اور دن مقرر کر رکھے ہیں۔

موضوعات کے اعتبار سے بھی بڑا تنوع آیا ہے، اکیلے عثمان غازی پر پانچ ناول ایک ہی شو روم میں موجود ہیں، تاریخ کا سیکشن عثمانی اور جمہوری دور میں الگ الگ بنائے جاتے ہیں اور دونوں میں ہزاروں ٹائٹلز موجود ہیں۔ سب سے بڑا سیکشن غالباً ترک ادبیات کا ہی ہوتا ہے۔ بعض ناول نگار جیسے الف شفق اور اورہن پامک تو عالمی شہرت کے حامل ہو گئے ہیں، لیکن بہت سے ایسے ہیں جو مشہور ہونے کے لیے ایک اچھے مترجم کا انتظار کر رہے ہیں۔ یعقوب قادری، رشاد نوری، خالدہ ادیب کی اہمیت آج بھی کم نہیں ہوئی ہے۔ نامق کمال، علی سوائی اور جمہوری دور میں صباح الدین علی، احمد حمدی، بیشار کمال، ناظم حکمت کی اہمیت ابھی بھی کم نہیں ہوئی ہے، لیکن اردوان کی آمد کے بعد سے نیا ادب بھی بہت زیادہ آ رہا ہے۔ ارھان بینر، وہبی وقاص اوغلو، نزلی ارے، فرید ادو، اور بہت سارے نئے ناول نگار مشہور ہوئے ہیں، البتہ جو بات اردو اور ترک ادبی ماحول کو الگ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ترکی زبان میں عالمی ادب کی تقریباً ہر اچھی کتاب فوراً ترجمہ ہو کر شائع ہو جاتی ہے اور عالمی کلاسیکی ادب تو ہر دکان میں ایک خاص شیلف میں رکھا جاتا ہے، لیکن اردو میں عالمی ادب کے ترجموں کی اس قدر مقبولیت نہیں ہے، یہاں تک کہ مدارس نے بھی جدید عربی اور فارسی ادب کے ترجمے پر توجہ نہیں دی

ہے۔یقیناً ترک حضرات غیر ملکی زبانیں سیکھنے میں دنیا میں سب سے پیچھے ہیں لیکن حال کے برسوں میں یہ رجحان تیزی سے بدلا ہے۔میرا خیال ہے کہ ہندوستان میں ویسے بھی شعر و ادب ایک گھاٹے کا شوق ہے، اور اس میں بھی اردو عربی تو گھر بیچ کر تماشا دیکھنے کے مانند ہے۔لیکن اگر مسلمان نوجوان عالمی ادب کا ہندی، بنگالی، ملیالی، تمل، تلگو اور کنڑ زبانوں میں ترجمہ کریں تو اچھی خاصی بڑی مارکیٹ ان کے پاس موجود ہے۔ہندوستان کے فکشن نان فکشن بازار میں اگر چیتن بھگت مقبول ہو سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلم نوجوان بھی عالمی زبانوں سے ترجمے کر کے اپنے لیے جگہ نہ بنا سکیں۔ اس لیے ترکی کی فکشن مارکیٹ ایک بہترین مثال ہے، جہاں ناول نگار اور شعرا حضرات ایک مطمئن زندگی گزار رہے ہیں۔

اگرچہ ہندوستان پاکستان کے مذہبی حلقوں میں عموماً شیخ سعید نورسی کی تحریریں ہی زیادہ مقبول ہوئی ہیں، لیکن ان کے علاوہ بہت سارے مفکرین ہیں جن کو جنوبی ایشیا کے اسلامی حلقوں نے اپنے یہاں ابھی تک متعارف نہیں کرایا ہے، ان ناموں میں خاص طور پر محمد عاکف ایرسوے، سعید حلیم پاشا، یوسف اکچورا، شیخ بندر زادے، اور دیگر اسلامی مفکرین نے ترکی کی اسلامی تحریکات پر گہرا اثر قائم کیا ہے۔اس لیے یہ بات زیادہ وزن نہیں رکھتی ہے کہ ترکی کا اسلامی رجحان اخوانی نہج کا ہے بلکہ شاید یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اخوانی فکر عثمانی مفکرین سے متاثر ہونے کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہوگی، کیوں کہ شیخ محمد عبدہ براہ راست جمال الدین افغانی کے شاگرد تھے اور جمال الدین افغانی نے سلطان عبد العزیز اور سلطان عبدالحمید کے دور میں پان اسلام ازم کی تحریک کی خوب حمایت کی تھی۔بہر حال عثمانی سلطنت کے آخری دور کے اہم مفکرین کے اہم کاموں کا تعارف احمد شیخوں نے اپنی کتاب Islamist Thinkers in the late Ottoman Empire and Early Turkish Republic میں تفصیل سے کرایا ہے۔ البتہ میرا خیال یہ ہے کہ عثمانی خلافت اور ہندوستانی مسلمانوں میں زوال کا ایک سبب مشترک ہے اور وہ یہ کہ عثمانی مفکرین بہت مخلص اور مبنی بر انصاف نظریات رکھنے کے باوجود اپنے افکار کو عربی زبان میں بروقت منتقل کرنے میں ناکام رہے، ان کی عثمانی ترکی زبان میں فکری بحثیں ان کی فکری پختگی کی دلیل ہیں، مثال کے طور پر اسلام ازم کیا ہے، اس کی تعریف عموماً تحریکی ادب میں بھی نہیں دی جاتی بلکہ ہندوستانی اور مصری اسلامی حلقے اسلام ازم کی اصطلاح سے قدرے تحفظ رکھتے ہیں، لیکن سعید حلیم پاشا ۱۹۰۹ء کے اپنے ایک مضمون میں اسلام ازم (اسلاماشمک) کی اصطلاح کا باقاعدہ تعارف پیش کرتے ہیں۔غالباً سب سے زیادہ زمینی مفکر علی سوائی کو قرار دیا جا سکتا ہے جنہوں نے ۱۸۶۷ء کے علوم گزیٹ میں حاکمیت خدا کا تفصیلی تعارف پیش کیا تھا۔میرا خیال ہے کہ اس دور کے عثمانی مفکرین کے علمی کارنامے اردو اور عربی زبان میں نہیں پہنچے ہیں، جب سے میں نے عثمانی ترکش سیکھنا شروع کیا ہے میری دلچسپی اس دور کے ادب کی طرف بہت ہوئی ہے، اگر وقت اور وسائل میسر آئے تو انشا اللہ بعض عثمانی اسلامی مفکرین کا تعارف اردو یا انگریزی میں ضرور پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

(عمیر انس جواہر لعل یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی ہیں اور ترکی کی ایک یونیورسٹی میں بین الاقوامی تعلقات کے شعبے میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔)

(بحوالہ ہفت روزہ ''دعوت'' نئی دہلی)

'آیا صوفیہ' ترکی محتاط رہے!

روسی اہلکاروں اور کلیساؤں کے وفاق نے ترکی سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ استنبول میں واقع پرانے گرجا گھر اور یونیسکو کی جانب سے تاریخی ورثہ قرار دیے جانے والی عمارت ''آیا صوفیہ'' کو مسجد میں تبدیل کرنے سے متعلق احتیاط برتے۔

ترکی کی ایک اعلیٰ عدالت میں یہ دلائل چل رہے ہیں کہ کیا دنیا کے تعمیری عجائب میں سے ایک یعنی 'آیا صوفیہ' جس کی موجودہ حیثیت عجائب گھر کی ہے، اسے مسجد میں تبدیل کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔اس اقدام سے مغرب اور عیسائی برادری کے ساتھ کشیدگی میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

واضح رہے کہ ترکی کے اعلیٰ ترین انتظامی ادارے کونسل آف اسٹیٹ نے 'آیا صوفیہ' کو مسجد میں تبدیل کرنے سے متعلق فیصلہ مؤخر کر دیا تھا۔

روس میں کلیساؤں کے وفاق کے سربراہ سردار کیرل نے کہا ہے کہ وہ اس اقدام سے 'گہری تشویش میں مبتلا ہیں'۔

آرتھوڈوکس چرچ کے رہنما نے ایک بیان میں کہا 'آیا صوفیہ' کے لیے خطرہ پوری عیسائی تہذیب اور ہماری روحانیت اور تاریخ کے لیے خطرہ ہے۔انہوں نے کہا 'آج قدیم کلیسا کو ماننے والے ہر روسی کے لیے 'آیا صوفیہ' ایک عظیم عیسائی عبادت گاہ ہے'۔انہوں نے ترک حکومت سے محتاط رہنے کی اپیل کی۔انہوں نے کہا کہ تاریخی عمارت کی موجودہ غیر جانبدار حیثیت میں ردّوبدل روسی عوام کے لیے ''گہرے درد'' کا باعث ہوگا۔

کریملن کے ترجمان دمتری پیسکوف نے کہا کہ تاریخی مقام کا مستقبل ترکی کا اندرونی مسئلہ ہے، تاہم انہوں نے کہا کہ امید ہے کہ عالمی ثقافتی ورثے کے طور پر آیا صوفیہ کی حیثیت کو بھی مدنظر رکھا جائے گا۔

انہوں نے کہا کہ سابق گرجا ایک 'عالمی شاہکار' تھا جو روسیوں کے لیے 'مقدس قدر' رکھتا ہے۔

نائب وزیر خارجہ سیرگئی ورشینن نے صحافیوں کو بتایا روس کو امید ہے کہ 'آیا صوفیہ' کی عالمی اہمیت کو مدنظر رکھا جائے گا۔

آیا صوفیہ کو پہلی بار چھٹی صدی میں عیسائی بازنطینی سلطنت میں مرکزی گرجا گھر کے طور پر تعمیر کیا گیا تھا، لیکن ۱۴۵۳ء میں عثمانیوں کی جانب سے قسطنطنیہ کی فتح کے بعد اسے مسجد میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔

اس گرجا گھر کو مسجد میں تبدیل کرنے کی تحریک کو ترکی کی حکمران جماعت جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی (اے کے پی) کی جانب سے مذہبی اور قدامت پسند ووٹروں کو اپنی جانب متوجہ کرنے کا ایک حربہ قرار دیا جا رہا ہے اور اس عمل کو تنقید کا نشانہ بھی بنایا جا رہا ہے، عمارت کی حیثیت اور اس کے مستقبل کا تعین اے کے پی کی انتخابی مہم کا ایک اہم موضوع تھا۔

ترکی کی سیکولر جماعتوں اور عالمی برادری کی جانب سے اس مہم کی مخالفت کے باوجود ملک کے قدامت پسندوں کی جانب سے اس گرجا گھر کو مسجد میں تبدیل کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔

(بحوالہ: ''اردو نیوز ڈاٹ کام''۔۶ جولائی ۲۰۲۰ء)

مابعد حقیقت، جعلی خبریں اور میڈیا

India Misinformed کا تعارف

عرفان وحید

زیر نظر کتاب ان مضامین کا انتخاب ہے، جو معروف فیکٹ چیکنگ ویب سائٹ آلٹ نیوز میں گزشتہ چند برسوں میں شائع ہوئے۔ یہ تمام مضامین ان جعلی خبروں اور افواہوں کے تجزیے اور تردید پر مبنی ہیں جو وقتاً فوقتاً سوشل میڈیا اور مین اسٹریم میڈیا میں آتی رہی ہیں۔ کتاب کے مدیر اور آلٹ نیوز کے بانی پرتیک سنہا کے مطابق آلٹ نیوز کی داغ بیل ۲۰۱۷ء میں ہونے والی بہیمانہ لنچنگ سے چند مہینے پہلے فروری ۲۰۱۷ء کو احمد آباد کے ایک چھوٹے سے کمرے میں ڈالی گئی۔ اس ویب سائٹ کا مقصد سوشل میڈیا اور ہندوستانی مین اسٹریم میڈیا میں پھیلائی جانے والی غلط اطلاعات اور پروپیگنڈے کا سدباب کرنا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہمارے ایک اولین فیکٹ چیکنگ تجزیے میں دکھایا گیا کہ کس طرح گوئٹے مالا میں ایک نوجوان عورت کو مبینہ طور پر کسی ٹیکسی ڈرائیور کو گولی مارنے کی پاداش میں زندہ جلائے جانے کی حساس ویڈیو یہ بتا کر شیئر کی گئی کہ مذکورہ خاتون ایک مارواڑی خاندان کی ہندو عورت تھی جسے مسلمان زندہ جلا رہے تھے۔ تب سے اب تک ہم نے ایک ہزار سے زیادہ تجزیے رقم کیے ہیں اور ہندوستان میں سب سے زیادہ وائرل ہونے والی جعلی خبروں کو ڈاکومنٹ کیا ہے''۔

انڈیا مس انفورمڈ (India Misinformed: The True Story، مدیران پرتیک سنہا، سمیہ شیخ، ارجن سدھارتھ، ہارپر کولنز پبلشرز انڈیا، ۲۰۱۹، صفحات ۴۰۳) میں جملہ ۸۲ تجزیے ہیں، جنھیں گیارہ فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ فصلیں اس طرح ہیں: فرقہ وارانہ نزاع کا فروغ، برانڈ مودی کی تشکیل، راہل گاندھی پسندیدہ ہدف، وزیر اعظم مودی اور بی جے پی نشانہ، دیگر سیاست دان جنھیں نشانہ بنایا گیا، غلط تاریخی دعوے، مین اسٹریم میڈیا، عام افراد، جعلی پول اور اکاونٹ، متفرقات اور سائنس۔ سنہا کے بقول گزشتہ دو برسوں میں تلبیسِ اطلاعات (misinformation) کا ایک واضح پیٹرن ابھرا ہے۔ ''دائیں بازو کے پروپیگنڈے کا محور بڑی حد تک مسلمانوں کو نشانہ بنانے والی غلط اطلاعات پر مبنی ہے۔ سنہا لکھتے ہیں: ''خواہ کرکٹ میں پاکستان کے جیتنے پر مسلمانوں کے جشن منانے کی جعلی ویڈیو ہوں، یا امرتسر ٹرین حادثے میں ٹرین کے ہندو ڈرائیور کو مسلمان قرار دے کر اسے سوچی سمجھی سازش قرار دینا۔ مقصد ایک ہی ہے کہ اقلیتوں کو ایک مخصوص رنگ میں پیش کر کے ملک مخالف سرگرمیوں میں ملوث دکھایا جائے''۔

منتخب نمونہ از خروارے، انڈیا مس انفورمڈ میں جن جعلی خبروں کو حقائق کی بنیاد پر رد کیا گیا ہے، ان میں سے چند دعوے دیکھتے چلیں:

دعویٰ: ہندوستان میں پناہ گزیں روہنگیا کی آبادی ۱۱ کروڑ ہو چکی ہے۔ نیز ملک میں غیر قانونی طور پر ۸ کروڑ بنگلا دیشی در انداز موجود ہیں۔

حقیقت: آلٹ نیوز نے ثابت کیا کہ اعداد و شمار جعلی ہیں۔ پورے میانمار کی جملہ آبادی بھی اس تعداد سے نصف سے کم ہے۔ مزید برآں ستمبر ۲۰۱۷ء میں پارلیمان کو دیے گئے ایک بیان میں وزارت داخلہ کے وزیر مملکت کرن رجیجو نے اطلاع دی تھی کہ ہندوستان میں محض ۴۰ ہزار روہنگیا پناہ گزیں مقیم ہیں۔

دعویٰ: امرتسر ٹرین حادثہ کوئی حادثہ نہیں تھا، بلکہ 'ٹرین جہاد' تھا جسے اتیاز علی نامی مسلمان نے انجام دیا۔

حقیقت: یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ مذکورہ ٹرین کے ڈرائیور کا نام اروند کمار تھا۔ ہندوستانی خبر رساں ادارے اے این آئی نے ڈرائیور اور ٹرین کے دستاویز حاصل کر کے اس کی تصدیق کی۔

دعویٰ: بھدوہی اتر پردیش میں سوامی وویکانند کی مورتی کی مسلمانوں نے بے حرمتی کی۔

حقیقت: بھدوہی پولیس سپرنٹنڈنٹ کے ذریعے اس معاملے کی تحقیق کرنے پر پایا گیا کہ پریم چندر گوتم نامی ایک شخص اس معاملے میں قصوروار ہے۔ اسے حراست میں لے لیا گیا۔

دعویٰ: ۲۰۱۶ء میں نیشنل کرائم ریکارڈ بیورو کے اعداد و شمار کے مطابق عصمت دری کے ۹۶ فیصد واقعات میں مسلمان ملوث تھے۔

حقیقت: تحقیق کرنے پر پایا گیا کہ قومی کرائم ریکارڈ بیورو عصمت دری کے اعداد و شمار مذہب کی بنیاد پر جاری نہیں کرتا۔

دعویٰ: سوشل میڈیا پر ایک انفوگرافک میں دعویٰ کیا گیا کہ وزیر اعظم مودی کی مختلف مساعی کی معروف مارکیٹنگ گورو فلپ کوٹلر، آکسفرڈ یونیورسٹی کے وائس چانسلر لوئیس رچرڈ، عالمی بنک کے سربراہ جم یونگ کم نیز مائکروسافٹ کے بانی بل گیٹس نے توصیف و ستائش کی ہے۔

حقیقت: آلٹ نیوز نے مذکورہ تمام سرکردہ شخصیات کے دفاتر سے رابطہ کیا اور اس خبر کے حوالے سے استفسار کیا۔ بل گیٹس کو چھوڑ کر بقیہ تین افراد کے دفاتر نے میل کا جواب دیا اور مذکورہ انفوگرافک کی تردید کی۔ البتہ میڈیا میں بل گیٹس کے حوالے سے بھی ایسی کوئی معتبر خبر نہیں پائی گئی۔

دعویٰ: وزیر اعظم مودی نے ٹویٹ لکھا: جب انگریزوں نے بھگت سنگھ کو گرفتار کیا تھا تو ایک بھی کانگریسی لیڈر ان سے ملنے جیل نہیں پہنچا۔

حقیقت: آلٹ نیوز نے اس ٹویٹ کو بے بنیاد قرار دیا۔ جواہر لعل نہرو نے اپنی خودنوشت سوانح میں بھگت سنگھ سے جیل میں ملاقات کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی کئی کانگریسی لیڈروں نے ملاقات کی تھی۔

دعویٰ: میرٹھ میں متعدد مسلم خواتین نے رام مندر کی تعمیر کی حمایت میں جلوس نکالا۔

حقیقت: رپورٹ گمراہ کن ہے۔ مذکورہ خواتین آر ایس ایس کی ذیلی تنظیموں مسلم راشٹریہ منچ نیز راشٹریہ ایکتا مشن کی رکن تھیں۔

دعویٰ: مرکزی وزیر ہرش وردھن نے ٹویٹ کیا: اسٹیفن ہاکنگ کے بقول ویدوں کا نظریہ آئن اسٹائن کے نظریے سے بہتر ہے۔

حقیقت: اسٹیفن ہاکنگ نے ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا۔

ہم عہد مابعد حقیقت (Post-truth era) میں جی رہے ہیں۔ اس عہد میں بیشتر لوگ حقیقی اور معروضی اطلاعات کی جستجو کرنے اور ان پر یقین کرنے کے بجائے ان اطلاعات پر یقین کرنے کا میلان رکھتے ہیں جو ان کے جذبات اور ذاتی اعتقادات سے مطابقت رکھتے ہوں۔ لوگوں کے اطلاعات کے حصول میں ان کی نفسیات کی ادراکی جہت (cognitive) کے مقابلے میں جذباتی جہت (affective) کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے۔ پوسٹ ٹرتھ عہد کی اسی خصوصیت کی وجہ سے جعلی

خبروں کی ترسیل وابلاغ ایک ناگزیر حقیقت بن چکی ہے، اور جعلی خبروں اور اطلاعات کے ابلاغ کا سدباب کرنا نہایت مشکل ہو گیا ہے۔

اطلاعات کی تشکیل و ابلاغ ہمیشہ ہماری زندگی اور معاشرے کا اہم جز بنے رہیں گے اور یہ ہماری فکر اور دنیا کے ساتھ ہمارے رویے کو بھی متاثر کرتے رہیں گے۔ تاہم جتنی زیادہ اطلاعات تک ہماری رسائی ہوگی، معیاری اطلاعات کو چننا اور اپنی زندگی اور انفرادی ضرورتوں کے لیے انھیں استعمال کرنا اتنا ہی مشکل ہوگا۔ جعلی خبروں کی تشکیل وترسیل کے اس ڈسکورس میں میڈیا اور سوشل میڈیا کا کردار مرکزی اہمیت کا حامل ہے۔ جے روزن (Jay Rosen) جو نیویارک یونیورسٹی میں صحافت کے پروفیسر اور میڈیا کے ناقد ہیں، ہمیں فیک نیوز اور ''متبادل حقائق'' کے ذریعے پیدا کردہ 'الجھن' (production of confusion) سے خبردار کرتے ہیں۔ ان کی رائے میں ''مخاطب کے ذہن میں الجھن پیدا کرکے اقتدار کی حامل قوتیں کنٹرول حاصل کرتی ہیں اور الجھن پیدا کرنے والی اطلاعات کو سننے کے بعد مخاطب کو ان منطقی سوالات کی پروا نہیں رہتی، جو حقائق کی جستجو کے لیے اٹھتے ہیں''۔

الجھن کی پیداوار برسر اقتدار قوتوں کی میڈیا کے عمیق قواعد (deep grammar) یا تجارتی ماڈل خبروں کے اداروں کو اپنی مرضی سے چلانے میں معاون ہوتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ خبر رساں اداروں کو ان کے انٹرویو لینے، ان سے دستاویزات اور معلومات حاصل کرنے اور اطلاعات بہم پہنچانے کے لیے ان کی ضرورت ہے۔ روزن کے مطابق میڈیا کی یہ ڈیپ گرامر (یعنی نیوز اداروں کو چلانے کے پیچھے کا تجارتی ماڈل) انھیں اپنی اخلاقیات کو نظر انداز کرنے اور معیار سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور کر دیتا ہے اور وہ جعلی خبروں کی تردید اس طرح نہیں کرتے جیسا کہ کرنا چاہیے کیونکہ ایسا کرنے پر وہ اطلاعات کے ان ماخذ سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے جن کی وجہ سے وہ مسابقتی دوڑ میں اپنا وجود قائم رکھتے ہیں۔

جعلی اطلاعات (fake information or alternative facts) کی دو ادراکی سطحیں ہیں: تلبیسِ اطلاعات (misinformation) اور تدلیسِ اطلاعات (disinformation)۔ انھیں ایک ہی سکے کے دو پہلو سمجھیں۔ تلبیس یا مِس انفارمیشن ہر وہ اطلاع ہے جو نامکمل ہوتی ہے۔ تاہم غیر یقینی، مبہم اور ذو معنی بھی ہوتی ہے۔ البتہ تلبیس سیاق وسباق کے لحاظ سے سچ، درست اور معلومات افزا بھی ہوسکتی ہے۔ آکسفرڈ ڈکشنری نے ڈِس انفارمیشن کی تعریف ''قصداً غلط اطلاعات کی ترسیل'' کے طور پر کی ہے۔

انڈیا مس انفورمڈ میں پرتیک سنہا کہتے ہیں کہ افواہوں اور جعلی خبروں کا ایک تھیم وطن پرستی پر مبنی ہے۔ تاریخی حقائق کو مسخ کرکے پیش کرنا بھی جعلی خبروں کا محبوب موضوع ہے۔ صحافیوں، سماجی کارکنان، لبرلز اور ہر اس شخص کو ہدف بنانا بھی خاص موضوع ہے، جو دائیں بازو کے خیالات سے ہم آہنگ نہیں یا ان کی نکتہ چینی کرتا ہے۔ وزیر اعظم مودی اور بی جے پی اقتدار کی حصول یابیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا بھی جعلی خبریں پھیلانے والوں کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ آلٹ نیوز نے نوٹوں کی منسوخی کے اقدام کو نوبیل انعام یافتہ دانشور اور بین الاقوامی راہنماؤں کے ذریعے سراہے جانے کی جعلی خبروں کی تردید کی ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ تمام جعلی خبریں دائیں بازو کے خیمے سے ہی پیدا ہوتی ہوں۔ آلٹ نیوز نے ان خبروں کا بھی تجزیہ کیا ہے جو اپوزیشن کے کیمپوں سے وضع کی جاتی ہیں اور انھیں عام کیا جاتا ہے۔ البتہ یہ بات مسلّم ہے کہ اس کی رسائی اور وسعت اتنی نہیں جتنی بی جے پی کے آئی ٹی سیل کی ہے۔

انتخابات کے دوران جعلی خبروں کا بازار خوب گرم ہوتا ہے اور دونوں جانب سے سیاسی پارٹیاں غلط اطلاعات کی خوب تشہیر کرتی ہیں، جو معاشرے میں مزید خلیج پیدا کرنے کا سبب بنتی ہیں۔ مغربی بنگال میں فسادات کے دوران ایک فلم کی تصویر کو یہ بتا کر خوب شیئر کیا گیا کہ مسلمانوں کے ذریعے ایک ہندو عورت کی حرمت پامال کی جا رہی ہے۔

سوشل میڈیا ہر قسم کی اطلاعات، خواہ وہ جعلی ہوں یا تصدیق شدہ، پھیلانے کا اہم ذریعہ ہے۔ چنانچہ یہ انفارمیشن اوورلوڈ میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اطلاعات خواہ پڑھی جائیں یا نہ پڑھی جائیں انتہائی سرعت سے آگے بھیجی جاسکتی ہیں۔ TL;DR ایک مقبول مخفف بن گیا ہے، جس کا مطلب ہے کہ طوالت کی وجہ سے پورا نہیں پڑھا گیا۔ گویا یہ قاری کو ایسے مواد کو شیئر کرنے اور اس پر تبصرہ کرنے کا حق دے دیتا ہے جس کو اس نے تحقیق وتصدیق تو دور پورا بھی نہیں پڑھا۔ یہ رویہ سوشل میڈیا میں فیک نیوز کی ترویج واشاعت میں اہم کردار ادا کرتا ہے، جسے کسی مخصوص پروپیگنڈا کی مستقل اشاعت کے ذریعے رائے عامہ کی ہمواری میں استعمال کیا جاتا ہے۔ نازی جرمنی میں ہٹلر کے پروپیگنڈا منسٹر جوزف گوئبلز سے دو مشہور اقوال منسوب ہیں، اگرچہ بعض محققین کو اس میں اختلاف ہے کہ یہ گوئبلز کے اقوال نہیں ہیں: ''اگر آپ کسی جھوٹ کو بار بار دہراتے رہیں تو نہ صرف لوگ اس پر یقین کرلیں گے بلکہ آپ خود بھی اس پر یقین کرنے لگیں گے''۔ نیز ''پروپیگنڈا تب ثمر آور ہوتا ہے جب اس سے متاثر ہونے والے افراد سمجھنے لگیں کہ وہ اپنی مرضی اور شعور سے اس پر عمل پیرا ہیں''۔

مصنف شوم شنکر سنگھ، جو بی جے پی کے سابق انتخابی مشیر اور کتاب How to Win An Indian Election کے مصنف ہیں، کہتے ہیں کہ انتخاب جیتنے کے لیے سیاسی پارٹی یا کسی سیاست دان کو رائے عامہ پر کنٹرول ضروری ہے۔ یہ کنٹرول انتخاب جیتنے کے بعد بھی ضروری ہے کیونکہ نظام میں تبدیلی کے لیے رائے عامہ کا ہموار ہونا ضروری ہے۔ ایسا صرف تبھی ممکن ہے جب مستقل پیغامات اور پروپیگنڈا کا استعمال کیا جائے۔ اس کام کے لیے سوشل میڈیا لوگوں کی رائے عامہ اور ڈسکورس کو رخ دینے میں سب سے موثر وسیلہ ہے۔ بی جے پی نے فیس بک، ٹوئٹر اور وہاٹس اپ گروپس کو مختلف مسائل پر رائے عامہ کی تشکیل کے لیے سب سے زیادہ استعمال کیا ہے بلکہ وہی طے کرتی ہے کہ کن مسائل پر گفتگو کی جائے۔

اس کام کے لیے منصوبہ بند طریقے سے وہاٹس اپ، فیس بک اور ٹوئٹر پر فرضی ناموں سے اکاؤنٹ تشکیل دیے جاتے ہیں۔ پرتیک سنہا نے زیر نظر کتاب میں لکھا ہے کہ متعدد فیکٹ چیکنگ ویب سائٹیں سرگرم ہونے کے بعد جعلی خبروں کی تشہیر کرنے والے محتاط ہو گئے، تاہم جعلی ناموں سے نئے اکاؤنٹ تیزی سے بننے لگے۔ فیس بک پر پیشہ ورانہ انداز میں معیاری انفوگرافکس اور ویڈیو شیئر کی جانے لگیں۔ آلٹ نیوز نے ایسے گروپس بھی دریافت کیے جو سیاسی فیس بک پیج خریدنے اور بیچنے کا کام کرتے تھے۔ بعض مقبول موضوعات جیسے انڈین آرمی، معروف کرکٹ کھلاڑی جیسے وریندر سہواگ، دائیں بازو کے بڑے لیڈر جیسے نریندر مودی، یوگی آدتیہ ناتھ وغیرہ کے لیے مختص پیج اور گروپس انتہائی اونچے داموں میں فروخت ہوئے جن کو فالو کرنے والوں کی تعداد لاکھوں بلکہ کروڑوں میں تھی۔

ان گروپس کے ذریعے نہایت سرعت سے کسی بھی خبر کو پورے ملک میں پھیلایا جاسکتا ہے۔ ہندوستان میں فیک نیوز کو تیزی سے مشتہر کرنے والا سب سے مؤثر پلیٹ فارم

وہاٹس ایپ ثابت ہوا ہے۔ اس کی اثر پذیری کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۲۰۱۴ء سے ۲۰۱۸ء کے درمیان گؤکشی اور بچوں کے اغوا سے متعلق افواہوں کی وجہ سے ۴۱ لوگوں کو ہجومی تشدد میں قتل کردیا گیا۔

ٹیکنالوجی کی تیز رفتار ترقی فیک نیوز کی ترسیل کے ساتھ ساتھ انھیں صارفین کے لیے قابلِ یقین بنانے کی سمت میں بھی کام کر رہی ہے۔ مصنوعی ذہانت (artificial intelligence) کے استعمال سے ایسا مواد، ویڈیو اور تصویریں، تیار کی جاسکتی ہیں جو حقیقی لگتی ہیں۔ اسے ڈیپ فیک ٹیکنالوجی کہتے ہیں۔ اس کے ذریعے ایسی ویڈیو اور تصاویر کی تیاری ممکن ہے، جن میں لوگوں کو ایسی باتیں کہتے ہوئے دکھایا جاسکتا ہے جو انھوں نے کبھی نہ کہی ہوں اور ایسے کام کرتے ہوئے دکھایا جاسکتا ہے جن کے کرنے کا انھوں نے کبھی تصور بھی نہ کیا ہو۔ انٹرنیٹ پر ایسی بہت سی ڈیپ فیک ویڈیو موجود ہیں جو وائرل ہوئیں۔ مثلاً امریکی سابق صدر اوباما کی صدر ٹرمپ کو گالی دینے کی ویڈیو، مارک زکربرگ کا اعتراف کرنا کہ فیس بک کا اصل مقصد لوگوں کے ذہن کو بدلنا اور ان کا استحصال کرنا ہے، وغیرہ۔ یہ چیلنج اتنا سنگین ہے کہ ایک امریکی سینیٹر مارکو روبیو کے بقول:

''اگلے زمانے میں اگر آپ کو امریکا کو خوفزدہ کرنا ہوتا تو آپ کو دسیوں بحری بیڑوں، جوہری ہتھیاروں اور طویل فاصلے کے میزائلوں سے لیس ہونے کی ضرورت پڑتی تھی، لیکن آج اس کام کے لیے محض ایک حقیقی نظر آنے والی فیک ویڈیو ہی کافی ہے، جو اتنی تباہ کن ہوسکتی ہے کہ ہمارے انتخابات کو تہس نہس کردے اور ہمارے ملک کو ایسے داخلی بحران سے دوچار کردے کہ اس سے ہم انتہائی کمزور ہو جائیں''۔

اور ٹیکنالوجسٹ اس بات سے پوری طرح متفق نظر آتے ہیں۔ ڈیپ فیک کے عالمی سطح پر چوٹی کے ماہر ہانی فرید کہتے ہیں:

''اگر ہم دنیا کے مختلف حصوں سے حاصل ہونے والی اطلاعات ویڈیو، آڈیو، تصاویر اور اطلاعات پر حتمی بات نہ کہہ سکیں تو یہ قومی سلامتی کے لیے ایک انتہائی سنگین خطرے کا اشارہ ہوگا''۔

۲۰۱۸ء کے اواخر میں محض ایک ویڈیو کے ڈیپ فیک ہونے کے شبہ کی بنیاد پر ایک ملک کی حکومت غیر مستحکم ہوگئی تھی۔ گیبون کے صدر علی بونگو چند مہینوں سے عوامی طور پر نظر نہ آئے۔ افواہیں گرم ہونے لگیں کہ وہ یا تو بہت بیمار ہیں یا چل بسے۔ ان خدشات کے ازالے کے لیے ان کی انتظامیہ نے اعلان کیا کہ وہ نئے سال کے موقع پر ٹیلی وژن پر قوم سے خطاب کریں گے۔ ان کے خطاب کی ویڈیو میں بونگو خاصے اکھڑے اکھڑے سے نظر آئے اور ان کی تقریر بھی میکانکی محسوس ہوئی۔ چنانچہ ان کے سیاسی مخالفین نے افواہ اڑادی کہ ویڈیو ڈیپ فیک تھی اور بونگو انتقال کرچکے ہیں۔ یہ افواہیں سوشل میڈیا میں بہت تیزی سے پھیل گئیں اور ملک کی حالت غیر مستحکم ہوگئی۔ ایک ہفتے کے اندر فوج نے اس ویڈیو کی بنیاد پر حکومت کا تختہ الٹنے (coup) کی کوشش کی، تاہم ناکام رہی۔ اس کے بعد بونگو عوام میں آئے اور اپنا قلم دان سنبھال لیا۔

فیک نیوز کے سلسلے میں مصنف اویو اوادیا (Aviv Ovadya) حقیقت کے تئیں ایک طرح کی لاتعلقی (reality apathy) کے سلسلے میں خبردار کرتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ ''یہ معلوم کرنا کہ کیا حقیقت ہے اور کیا نہیں، بہت مشکل امر ہے۔ چنانچہ آپ اپنے سابقہ اعتقاد پر قائم رہتے ہیں''۔ دوسرے الفاظ میں اسے اطلاعاتی تعصب (information bias) کہا جاسکتا ہے یعنی مخاطب کے ذاتی میلانات اور تعصب کی وجہ سے اطلاعات کو اخذ کرنا اور ان سے اثر لینا۔ مصنف شوم شنکر کہتے ہیں کہ فیس بک اور ٹوئٹر کے الگورتھم اس تعصب کو مزید مستحکم کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔ اگر صارف دائیں بازو والے افکار کی جانب میلان رکھتا ہے اور اسی طرح کی خبریں اور اطلاعات پڑھتا اور شیئر کرتا رہا ہے تو ایسا شاذ ہی ہوتا ہے کہ اسے متبادل نظریے کی حامل اطلاعات مل سکیں۔ چنانچہ ایسے فرد تک فیکٹ چیکنگ والی اطلاعات کی رسائی نہیں ہوپاتی۔ گویا فیکٹ چیکنگ ویب سائٹ کے صارفین بھی وہی ہیں جو پہلے سے جعلی خبروں سے محفوظ ہیں یا دائیں بازو سے مختلف رائے رکھتے ہیں۔

اس تناظر میں ایک ایسی دنیا میں جہاں اب یقین کی بنیاد مشاہدے پر نہیں رہی کسی بڑے گروہ کا حقیقت سے اتفاق کرلینا ایک دشوار بات ہے، اسے تعمیری مکالمے کی طرف موڑنا دشوارتر امر ہے۔

فیک نیوز کے اس طوفان بے تمیزی میں سب سے پریشان کن بات یہ ہے کہ ان کی تشہیر کرنے والوں کو سیاسی سرپرستی حاصل ہے۔ ٹوئٹر پر ایسے سیکڑوں اکاؤنٹ موجود ہیں جنھیں جعلی خبریں نشر کرنے میں سرگرم پایا گیا۔ ان اکاؤنٹس کو مرکزی وزرا یہاں تک کہ وزیر اعظم مودی کے ذریعے فالو کیا جاتا ہے۔ متعدد اکاؤنٹ ایسے بھی ہیں جن کے چلانے والوں کی تصویریں وزیر اعظم مودی کے ساتھ ان کے پروفائل پیج کی زینت ہیں۔ سنہا کے بقول اگر تلبیسِ اطلاعات کو اسی طرح سیاسی سرپرستی حاصل رہی تو جعلی خبروں کا یہ طوفان تھمنے والا نہیں۔

میگسیسے ایوارڈ یافتہ معروف صحافی رویش کمار نے اس کتاب کا دیباچہ لکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

دنیا کی کسی بھی جمہوریت کے مستقبل کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ اس کے شہری کتنے باخبر اور چوکس ہیں۔ شہریوں کی اس باخبری کو جعلی خبروں سے بڑی ہوشیاری سے بدلنے کی کوشش کی گئی ہے۔ انھیں یہ باور کرایا گیا ہے کہ وہ محب وطن ہیں، جبکہ کچھ لوگ ملک کی ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔ افسوس کہ اس احساس کو جعلی خبروں کے ذریعے گڑھا جارہا ہے، تاکہ آپ خود کو حق بجانب سمجھتے ہوئے سامنے والے کے جھوٹ کی حمایت کرسکیں۔۔۔ کسی بھی حکومت کی کارکردگی کے جائزے کی بنیاد یہ ہونی چاہیے کہ اس کے دور میں میڈیا کتنا آزاد اور حقائق کے تعلق سے کتنا سنجیدہ ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو شہریوں کو حکومت سے پہلے خود اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ وہ واقعی شہری ہیں بھی یا نہیں۔ اس کتاب کو پڑھیے تاکہ آپ کو پتا چلے کہ آپ کے ساتھ کیسا فریب کیا گیا ہے اور کیسا فریب کیا جاسکتا ہے۔

انڈیا مس انفورمڈ ایسے منتخب تجزیوں کا عجائب خانہ ہے جو آنے والے وقت کے لیے ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس عجائب خانے کی سیر ہمارے لیے باعثِ عبرت بھی ہے اور ایک ایسے ملک کے باشندے ہونے کی حیثیت سے باعثِ عار بھی جسے اپنی تہذیبی واخلاقی روایات پر فخر ہے۔

(بحوالہ: ماہنامہ 'زندگی نو' نئی دہلی۔ جولائی ۲۰۲۰ء)

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کا شائع کردہ جدید ایڈیشن

حدیثِ نبویؐ اور سائنسی علوم

مولانا عبدالحق ہاشمی

قیمت: ۵۰۰ روپے

اکیڈمی بک سینٹر۔ D-35، بلاک۔5
فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی۔ فون:021-36809201

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950